TAMEER-E-HAYAT
ISSN - 2582-4619 - VOL 62 - ISSUE 21 & 22 - 10,25 SEPTEMBER 2025

تعمیرِ حیات

لکھنؤ

پندرہ روزہ

دعوت کے تین بنیادی اصول

''امت محمدیہ کے مزاج کے مطابق یہ ضروری ہے کہ داعی اور دعوت اور طریق دعوت تینوں چیزیں ٹھیک طریق نبوت اور اسوۂ نبوت کے مطابق ہوں، داعی خود بھی قلباً اور قالباً داعیٔ اول محمد رسول اللہ ﷺ سے نسبت رکھتا ہو، جس حد تک یہ نسبت قوی ہوگی، دعوت میں تاثیر اور کشش پیدا ہوگی، پھر ضروری ہے کہ دعوت وہی ہو، یعنی خالص اسلام اور ایمان وعمل صالح کی دعوت ہو، پھر دعوت کا طریق بھی وہی اختیار کیا جائے جو داعیٔ اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اختیار فرمایا تھا، جس حد تک ان تینوں امور میں عہدِ رسالت ونبوت کے ساتھ قرب ومناسبت جتنی زیادہ ہوگی اتنی ہی زیادہ دعوت کی قوت میں تاثیر اور دعوت کے دائرہ میں وسعت پیدا ہوگی، اور راہ کی ضلالت سے حفاظت اور صراطِ مستقیم کی طرف رہبری کی طاقت میں اضافہ ہوگا، گذشتہ صدیوں کے جن داعیانِ امت کے تجدیدی کارناموں کو اُمت نے تسلیم کیا ہے، ان کی تاریخ سے بھی ان اصولوں کی سچائی ثابت ہوتی ہے''۔

علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

یہ شمارہ ₹40/-

۱۰-۲۵/ ستمبر ۲۰۲۵ء

سالانہ زرتعاون ₹500

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پندرہ روزہ تعمیرِ حیات لکھنؤ

ISSN 2582-4619

جلد نمبر ۶۲ | ۱۰-۲۵ ستمبر ۲۰۲۵ء مطابق ۱۷ ربیع الاول - ۲ ربیع الثانی ۱۴۴۷ھ | شمارہ نمبر ۲۱-۲۲

اس شمارے میں

پاک دینے پاک بینے......	مولانا سید محمد ثانی حسنیؒ	۴
وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا	شمس الحق ندوی	۵
حقوقِ قرآن	حضرت مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی	۷
پروردگارِ بے نیاز کی.....	عبدالرشید راجستھانی ندوی	۱۰
سوال وجواب	مفتی محمد ظفر عالم ندوی	۱۲
نبوت کا پیغام اور اس کی ضرورت	مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی	۱۳
مولانا ضیاء الحسن علوی ندویؒ	محمد اجمل فاروق ندوی	۱۴
دعوتِ دین اور اس راہ کی آزمائشیں	پروفیسر محسن عثمانی ندوی	۱۶
دنیا تمہارے لئے اور تم آخرت کے لئے	ڈاکٹر سراج الدین ندوی	۲۰
عدت کی حکمت اور جدید سائنس	مولانا انیس الرحمٰن ندوی	۲۲
انسانی زندگی میں اے آئی کا دخل	مولانا مطیع الرحمٰن عوف ندوی	۲۴
احساسِ زیاں جاتا رہا	ڈاکٹر محمد وثیق ندوی	۲۷
عقل - زندگی کا محور	ڈاکٹر عبید الرحمٰن ندوی	۲۸
شرعی احکام کی اصطلاحات	ڈاکٹر محمد نصر اللہ ندوی	۲۹
'ولٰکن شُبه لهم' کی تفسیر	سلمان نسیم ندوی	۳۱
غزہ میں صحافیوں کی شہادت	ڈاکٹر محمد فرمان ندوی	۳۵
محمد مصطفیٰ ﷺ انسانِ کامل	محمد سمعان خلیفہ ندوی	۳۷
عورت کی خودمختاری	منور سلطان ندوی	۳۹
انسانی زندگی میں صبر وشجاعت	محمد جاوید اختر ندوی	۴۱
تعارف وتبصرہ	محمد اصطفاء الحسن ندوی	۴۲
زیتون کی وادی میں بھوک کا نوحہ	محمد نفیس خان ندوی	۴۵
کامیاب زندگی میں وحی الٰہی	سعید الرحمٰن اسامہ	۴۷
ندوۃ العلماء - منزل بہ منزل	محمد نفیس خان ندوی	۴۹

سرپرست

حضرت مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی

(ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

مدیر مسئول

شمس الحق ندوی

نائب مدیر

محمد عمیر الصدیق دریابادی ندوی

معاون مدیر

محمد اصطفاء الحسن کاندھلوی ندوی

محمد نفیس خان ندوی ❀ محمد جاوید اختر ندوی

مجلس مشاورت

مولانا عبدالعزیز بھٹکلی ندوی ❀ مولانا محمد خالد غازیپوری ندوی

قارئین محترم! تعمیرِ حیات کا سالانہ زرِ تعاون ذیل میں دیے گئے اکاؤنٹ میں جمع کرائیں!

TAMEER E HAYAT
A/c. No. 10863759868 (Current A/c.)
IFSC Code : SBIN0000125 -- Swift Code : SBINNB157
State Bank of India, Main Branch, Lucknow

براہِ کرم رقم جمع ہوجانے کے بعد دفتر کے فون نمبر یا ای میل پر خریداری نمبر کے ساتھ اطلاع ضرور دیدیں۔

ترسیل زر اور خط وکتابت کا پتہ

TAMEER-E-HAYAT
Tagore Marg, Badshah Bagh, Lucknow - 226007, Ph.:0522-2740406
website : http://tameerehayat.com - email : tameer1963@gmail.com

مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

سالانہ زرتعاون -/500	فی شمارہ -/25	ایشیائی، یورپی، افریقی وامریکی ممالک کے لئے۔ $100

ڈرافٹ منیجر تعمیر حیات کے نام سے بنائیں اور دفتر تعمیر حیات ندوۃ العلماء لکھنؤ کے پتہ پر روانہ کریں۔ چیک سے بھیجی جانے والی رقم صرف All CBS Payable Multicity Cheques روانہ فرمائیں، بصورت دیگر =/30₹ جوڑ کر چیک دیں۔ براہ کرم اس کا خیال رکھیں۔

آپ کی خریداری نمبر کے نیچے اگر سرخ لکیر ہے تو سمجھیں کہ آپ کا زرتعاون ختم ہوچکا ہے، لہٰذا جلد ہی زرتعاون ارسال کریں۔ اور منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیں، موبائل یا فون نمبر اور پتے کے ساتھ پن کوڈ بھی لکھیں۔ (منیجر تعمیر حیات)

پرنٹر پبلشر محمد طٰہٰ اطہر نے آزاد پرنٹنگ پریس، نظیر آباد، لکھنؤ سے طبع کرا کے دفتر تعمیر حیات مجلس صحافت ونشریات ٹیگور مارگ، بادشاہ باغ لکھنؤ سے شائع کیا۔

شعر و ادب

پاک دینے پاک بینے خوشتر از ہر خوشترے

مولانا سید محمد ثانی حسنیؒ

خاک کا یہ ذرہ ذکر مہ وشاں کیسے کرے
عشق کے راز نہاں کو وہ عیاں کیسے کرے
مدح آقا کی گدائے بے نشاں کیسے کرے
مشک سے دھوئے زباں کو پھر بیاں ایسے کرے
''کشت بے تیغم بعشوہ'' ترک نازک پیکرے
خوش بیانے مہر بانے جان جانے دل برے

نعت کہتا ہوں تری آقائے من شاہ زمن
نام پیارا کتنا تیرا پاک تن پاکیزہ من
خندہ رو، روشن جبیں، غنچہ دہن شیریں سخن
نکہتِ زلفِ معنبر پر فدا مشک ختن
یاسمن رشک سمن، جان چمن یا جان من
آشنائے دلربائے خود نمائے خود سرے

تو ہے بحرِ بیکراں اور میں ذرا سی آبجو
اے سراپا نور تو ہے دو جہاں کی آبرو
مرحبا صلِّ علیٰ جان جہان رنگ و بو
قیصر یت تیری آمد سے ہوئی ہے زرد رو
کفر سوزے دل فروزے خوب رو آہستہ خو
پاک دینے پاک بینے خوشتر از ہر خوشترے

اخترِ تاباں کہوں یا پھر مہِ کامل تجھے
میں کہوں کون ومکاں کی جاں یا پھر دل تجھے
میں سمجھتا ہوں نشانِ جادہ ومنزل تجھے
دل کھنچیں بے ساختہ وہ ہے کشش حاصل تجھے
نازنینے، مہ جبینے دل کشے یا دل کُشے
جاں گدازے دل نوازے گوہرے یا اخترے

کوچۂ جاناں گئے تو بن کے دیوانا گئے
بادۂ عشق ومحبت پی کے مستانا گئے
صبر آیا جب نہ ہم کو پھر تو روزانا گئے
نعت یہ پڑھتے ہوئے بے اختیارانا گئے
شادۂ آزادۂ مستانۂ جانانۂ
مست چشمے دیر خشمے طرفہ زیبا منظرے

اے سراپا خلق تیری ذات ہے ہر دلعزیز
تیرے صدقے میں خدا نے دی ہمیں عقل وتمیز
تیرے در کی خاک ہی سرمہ بنانے کی ہے چیز
توڑنا دم تیرے در پر جان و دل سے ہے عزیز
بے قرارم اشک بارم سخت زارم اے عزیزؔ
دل برد جاں آورد ہر دم بطرز دیگرے

اداریہ

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا

شمس الحق ندوی

ربیع الاول کا مہینہ قمری سال کا تیسرا مہینہ ہے۔ تاریخِ انسانی میں یہ وہ مبارک مہینہ ہے جس میں بھولی بھٹکی اور گم کردۂ راہ انسانیت کو فلاح وصلاح کی راہ دکھانے والا وہ دستورِ حیات ملا جو ہر قوم وہر ملک کے لوگوں کے لیے، ہر زمانہ وہر دور کے لوگوں کے لیے نسخۂ کیمیا ہے۔ اس دستورِ حیات میں نہ کالے گورے کا فرق رکھا گیا ہے، نہ عربی وعجمی کا، نہ بادشاہ وفقیر کا۔

''میں شہادت دیتا ہوں کہ انسان انسان بھائی ہیں''، جس کے منہ سے یہ بول نکلے تھے یہ اسی کی پیدائش کا مہینہ ہے۔ اس نے آکر دنیا کو یہ پیغام دیا تھا، بتایا تھا کہ نسل کی، رنگ کی، یا وطنی تقسیم کی بنا پر کسی سے جنگ کرنا یا کسی کو حقیر وذلیل سمجھنا حماقت ہے۔ یہ ساری چیزیں غیر اختیاری ہیں۔ انسان کے کردار کا، اس کے شرف وعظمت کا، ان سے کیا سروکار، اور اسی نے آکر یہ منادی کی تھی کہ ''الخلق عيال الله، فأحب الخلق إلى الله من أحسن إلى عياله'' (مخلوق اللہ کا کنبہ ہے، تو مخلوق میں اللہ کی نظر میں محبوب ترین وہی ہے جو اس کنبہ کے ساتھ بہترین سلوک سے پیش آئے)۔

مہر ومحبت کے اس پیامبر کو، شفقت والفت، ہمدردی وانسانیت کے اس سچے پیام رساں کو رسول بنا کر بھیجنے والے مالک وخالق نے اس کو ''وما أرسلناك إلا رحمة للعالمين'' (انبیاء: ۱۰۷) کے الفاظ سے مخاطب فرمایا ہے۔ چنانچہ دنیا نے دیکھا کہ اس نے مصائب ومشکلات کے ناقابلِ قیاس مرحلوں سے گزر کر پورے عالم کے لیے بارانِ رحمت بن کر انسانیت کی سوکھی ہوئی کھیتی کو گل وگلزار بنا دیا۔

آپ ﷺ کی آمد سے پہلے، ربیع الاول کی صبحِ سعادت سے قبل، انسانیت گراوٹ وپستی کے جس درجہ کو پہنچ چکی تھی، اس کے تصور وخیال سے دل دہل جائیں۔ آخری درجہ کی بات یہ ہے کہ امراء ورؤساء اپنی دعوتوں اور خوشیوں کی محفلوں میں چراغاں کرنے کے لیے زندہ انسانوں کو ستونوں سے باندھ کر ان کے جسموں پر تیل چھڑک کر جلاتے تھے۔ ان کی چیخ وپکار اور رونے چلانے کی آوازوں میں ان کو موسیقی کا مزہ آتا تھا، اور اس پر فخر کیا جاتا تھا کہ فلاں کے یہاں اتنے غلام جلائے گئے۔

ضعیفوں، مسکینوں، یتیموں، بیماروں کے ساتھ حسنِ سلوک اور مدارات کی جو ہدایتیں اس ہادی کی لائی ہوئی کتاب اور خود اس کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ میں ملتی ہیں، وہ اس کثرت سے ہیں کہ جمع کی جائیں تو خود ایک کتاب بن جائیں۔ بڑائی اور چھوٹائی اس عالمِ آب وگل کا بنیادی قانون ہے؛ کوئی امیر رہے گا، کوئی غریب؛ لیکن بڑے کو چھوٹے کے دبانے کا اور امیر کو غریب کے پیسنے کا، حاکم ومحکوم کے ستانے کا کوئی حق نہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''کیا تمھیں وہ بات نہ بتلا دوں جس سے اللہ تعالیٰ بلندی عطا کرے اور درجات کو اونچا کر دے؟''، صحابہ کرامؓ نے عرض کیا: ضرور ارشاد فرمائیے، آپؐ نے فرمایا: ''جو شخص تم سے جہالت کا معاملہ کرے تم اس سے بُردباری کا معاملہ کرو، اور جو ظلم کرے اس کو معاف کر دو، اور جس نے تم کو محروم کیا ہو اس کو عطا کرو، اور جو تم سے رشتہ توڑے تم اس سے جوڑو اور صلہ رحمی کرو'' (طبرانی)۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''طاقتور وہ نہیں جو کسی کو پچھاڑ دے، درحقیقت طاقتور وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے اوپر قابو رکھے (برداشت سے کام لے)'' (بخاری)۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کی مدد پر رہتا ہے، جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد پر رہتا ہے'' (مسلم)۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اللہ کی مخلوق میں کچھ لوگ ایسے ہیں جن کو اس نے پیدا ہی اس لیے کیا ہے کہ وہ لوگوں کی ضرورتیں پوری کریں۔لوگ گھبرائے ہوئے ان کے پاس اپنی ضرورتیں لے کر آتے ہیں'' (طبرانی)۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ قیامت کے دن فرزندِ آدم سے فرمائے گا کہ اے ابنِ آدم! میں بیمار پڑا تھا تو نے میری خبر نہیں لی؟ بندہ عرض کرے گا: اے میرے مالک! میں کیسے تیری تیمارداری یا بیمار پرسی کرسکتا تھا؟ تو تو رب العالمین ہے، بیماری کا تجھ سے کیا واسطہ؟! اور تیری بارگاہ میں اس کا کیا گذر؟! اللہ تعالیٰ فرمائے گا: کیا تجھے علم نہیں ہوا تھا کہ میرا فلاں بندہ بیمار پڑا تھا، تو نے اس کی عیادت نہیں کی اور خبر نہیں لی، کیا تجھے معلوم نہیں تھا کہ اگر تو اس کی خبر لیتا اور تیمارداری کرتا تو مجھے اس کے پاس ہی پاتا۔ اے ابنِ آدم! میں نے تجھ سے کھانا مانگا تھا تو نے مجھے نہیں کھلایا؟ بندہ عرض کرے گا: خداوندا! میں تجھے کیسے کھانا کھلاسکتا تھا؟ تو تو رب العالمین ہے، تجھے کھانے سے کیا واسطہ؟! اللہ تعالیٰ فرمائے گا: کیا تجھے معلوم نہیں کہ میرے فلاں بندہ سے تجھ سے کھانا مانگا تھا، تو نے اس کو کھانا نہیں دیا، کیا تجھے علم نہیں کہ اگر تو اس کو کھانا کھلاتا تو مجھے اس کے پاس پاتا۔ اے ابنِ آدم! میں نے پینے کے لیے تجھ سے پانی مانگا تھا، تو نے مجھے نہیں پلایا، بندہ عرض کرے گا: میں تجھے پانی کیسے پلاتا؟ تو تو رب العالمین ہے، تجھے پینے سے کیا واسطہ؟! اللہ تعالیٰ فرمائے گا: میرے فلاں بندہ نے تجھ سے پانی مانگا تھا، تو نے اس کو نہیں پلایا، سن! اگر تو اس کو پانی پلادیتا تو مجھے اس کے پاس پاتا'' (مسلم)۔

قارئینِ کرام! یہ چند فرمودات جو پیش کیے گئے، یہ فرمودات ہی نہ تھے؛ بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا عملی نمونہ تھے۔

اس وقت پورا عالمِ انسانی جن خطرناک اور وحشت ناک حالات سے گزر رہا ہے، وہ ہر شخص دیکھ سکتا اور محسوس کر رہا ہے؛ لیکن راہِ نجات نہیں دکھائی دیتی۔ دکھائی دے تو کیسے؟ ذرا غور سے کام لیا جائے تو صاف محسوس ہوگا کہ مادہ پرستی کے جوع البقر نے آج کی ترقی یافتہ دنیا کو پھر وہیں پہنچادیا ہے جہاں وہ بعثتِ نبوی سے پہلے تھی۔ اب اگر وہ اس بلائے بے درماں سے نجات حاصل کرنا چاہتی ہے تو اس کو پھر رحمتِ عالم کے دامنِ رحمت سے وابستہ ہونا پڑے گا۔

ربیع الاول کا مہینہ، وہ مبارک مہینہ ہے جس میں ربِ کریم نے افضل الخلائق، خاتم الانبیاء، امام الرسل، اپنے محبوب، محمدِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ کی سیاہ پہاڑیوں اور بے آب وگیاہ وادی میں نیرِ تاباں بنا کر پیدا فرمایا، کہ وہ انسانیت کی سوکھی اور جھلسی ہوئی کھیتی کو اپنے خون کے فوارے بہا کر اور آنسوؤں کی جھڑی لگا کر سرسبز وشاداب کرے۔ پھر کیا ہوا؟ اور کس کس طرح سے ہوا؟ اس پر میلاد کے جلسوں اور رسائل کے گوشہائے سیرت میں شرح وبسط کے ساتھ بولا اور لکھا جا رہا ہے۔ دل میں خیال آیا کہ میں بھی اس مناسبت سے کچھ لکھوں، سوچا اور سوچتا رہا کہ اس سعادت میں شرکت کے لیے کیا لکھوں؟۔ اسی سوچ میں میلاد النبی کے جلسوں کی جگمگاہٹ کا منظر نگاہوں میں پھرنے لگا، خطباء وشعراء کی آوازیں کانوں میں گونجنے لگیں، یہ ہوہی رہا تھا کہ خیال آیا کہ وہ جو سب کو جوڑنے اور ملانے کے لیے آیا تھا، اور جس کے دہنِ مبارک سے یہ میٹھے بول نکلے تھے یا نکلوائے گئے تھے: ''رحماء بینھم، تراھم رکعاً سجداً یبتغون فضلاً من اللہ ورضواناً'' (فتح:۲۹)، جنھوں نے نہ مانا ان کو کچھ کہنا بے سود ہے، جنھوں نے مانا اور مانا ہی نہیں، اس راہ میں اپنا تن من دھن سب کچھ نچھاور کردیا، اس کی ڈگر پر چلنے کے دعوی کرنے والوں کے اندرونی حالات اور زندگی کے لیل ونہار کیسے ہیں؟ کیا اقبال مرحوم نے کچھ غلط کہا ہے:

تم ہو آپس میں غضبناک ، وہ آپس میں رحیم
تم خطاکار و خطا بیں، وہ خطا پوش، کریم

اور:

ایک ہی صف میں کھڑے ہوگئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا، اور نہ کوئی بندہ نواز

تعلیم القرآن

حقوقِ قرآن

حضرت مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی

قرآن مجید کا پہلا حق ایمان کا ہے اور یہ ایمان تفصیلی ہے یعنی ایک ایک حرف اور ایک نقطے کے بارے میں سمجھنا کہ یہ حق ہے، پھر اس کی عظمت ہونی چاہیے، اس کے بعد تیسرا حق اس کی تلاوت کا ہے۔ آپ ﷺ نے ہمیں تلاوت سکھائی کہ اس کو کس طرح پڑھا جائے۔ فرمایا گیا:

{هُوَ الَّذِىْ بَعَثَ فِى الْأُمِّيِّيْنَ رَسُوْلاً مِّنْهُمْ يَتْلُوْ عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ} (الجمعة: ۲) (وہی ذات ہے جس نے اَن پڑھ لوگوں میں ان ہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کے سامنے اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے۔)

قرآن مجید کو سنت کے مطابق پڑھنے کو ''تجوید'' کہتے ہیں یعنی جس طرح آپ ﷺ نے پڑھا، اس کو ہمارے علماء نے محفوظ کیا اور اس کے طریقے بتائے' ان کو سیکھنا ضروری ہے تا کہ تجوید کے ساتھ تلاوت کی جائے، یہ بھی قرآن مجید کا حق ہے، پھر اس کے ساتھ اس کو یاد کیا جائے، اس کا بڑا حصہ حفظ ہو، کچھ لوگ تو پورا قرآن مجید یاد کریں اور کم از کم درجہ یہ ہے کہ ایک بڑا حصہ یاد ہو جو نماز میں پڑھنا ضروری ہے اور اتنا یاد ہونا فرض ہے، جب تک یاد نہ ہو آدمی کچھ بھی کر لے لیکن یاد کرنے کی کوشش کرتا رہے۔

قرآن مجید کو سمجھنا بھی ایک حق ہے، جس کے لیے اللہ نے یہ کتاب اتاری ہے اور اس کو {هُدًى لِّلنَّاسِ} کہا ہے، ظاہر ہے جب تک آدمی اپنے اندر قرآن مجید کا فہم پیدا نہیں کرے گا، قرآن مجید کو نہیں سمجھے گا، اس وقت تک آدمی ہدایت کے راستے کو اختیار نہیں کر سکتا، اس لیے یہ بھی قرآن مجید کا حق ہے کہ اگر عربی زبان میں آدمی کو مہارت حاصل ہے تو وہ قرآن مجید کو سمجھنے کی کوشش کرے۔

فہم قرآن کے لیے جو پندرہ علوم نقل کیے جاتے ہیں، ہم تو کہتے ہیں کہ اس میں دو چار علوم کے اضافہ کی بھی ضرورت ہے جیسے تاریخ وجغرافیہ ہے، یہ دو ایسے بنیادی علوم ہیں جن کو قرآن مجید کے فہم میں بڑا حصہ ہے، اگر قرآن مجید کا مکمل فہم آدمی حاصل کرنا چاہتا ہے تو ان علوم کی بھی ضرورت ہے مثلاً:

{لِإِيْلَافِ قُرَيْشٍ٭إِيْلَافِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَاءِ وَالصَّيْفِ٭فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هَذَا الْبَيْتِ٭الَّذِىْ أَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ وَآمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ} (قریش: ۴-۱) (قریش کے مانوس ہونے کی وجہ سے، جو وہ جاڑے اور گرمی کے سفر سے مانوس ہیں، بس انھیں چاہیے کہ وہ اس گھر کے رب کی عبادت کریں جس نے ان کو بھوک میں کھانا کھلایا اور خوف میں امن دیا)۔

یہ ایسی سورہ ہے کہ اگر آدمی وہاں کی تاریخ سے واقف نہیں، وہاں کے جغرافیہ سے واقف نہیں تو اس سورہ شریفہ کا فہم اس کو حاصل ہونا مشکل ہے، مفسرین نے جو پندرہ علوم نقل کیے ہیں ان میں یہ علوم بھی شامل ہیں، ان کی روشنی میں ہم پر لازم ہے کہ ہم قرآن مجید کا فہم پیدا کریں۔ جو حضرات عالم نہیں ہیں ان کے لیے بہتر ہے کہ ان کی اپنی اپنی زبانوں کے اعتبار سے جو آسان اور معتبر تراجم ہوں ان کا مطالعہ کریں، ان سے یہ سمجھنا ان شاء اللہ آسان ہوگا کہ قرآن مجید ہم سے کیا خطاب کر رہا ہے؟ یہ قرآن مجید کا حق ہے۔

قرآن مجید کا ایک بنیادی حق یہ بھی ہے کہ اس کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھالنے کی کوشش کی جائے، یہی اصل ہدایت ہے کہ آدمی اپنے آپ کو اس کے سانچے میں ڈھالے، قرآن مجید جو کہتا ہے، جیسی زندگی چاہتا ہے، جیسے عقائد چاہتا ہے، جیسی اخلاق کی بلندی چاہتا ہے، جیسے اعمال کی پابندی چاہتا ہے، اس کے مطابق ہم اپنے آپ کو ڈھالنے کی کوشش کریں۔ دنیا میں ہر چیز ڈھالی جاتی ہے، آپ کارخانوں میں دیکھیے، وہاں مشینیں لگی ہوتی ہیں، ان کے پاس خام مال لے جائیے، وہاں سے ایسی خوبصورت چیز تیار ہو کر آجاتی ہے بعض مرتبہ حیرت ہوتی ہے کہ کیسا خام مال تھا مگر کیسی خوبصورت چیز ڈھل کر سامنے آگئی۔ اسی طرح اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا ہے، وہ چاہتا ہے کہ انسان کو قرآن کے سانچے میں ڈھالا جائے اور یہ چیز ہمیں اللہ کے نبی ﷺ کی زندگی سے پوری طرح معلوم ہوتی ہے۔ حاصل یہ کہ ہم اس بات کے مکلف ہیں کہ اپنے آپ کو قرآنی سانچے میں ڈھالیں، قرآن سے نسبت پیدا کریں، اس سے ایسا تعلق پیدا ہو کہ ہماری زندگی قرآن کا عکس نظر آئے، یہ بھی قرآن مجید کا بنیادی حق ہے، اسی لیے یہ کتاب اتری کہ یہ کتاب ہدایت ہے۔

قرآن مجید کا یہ بھی حق ہے کہ ہم اس کے پیغام کو دنیا میں عام کریں، دنیا میں اس کے پیغام کو پھیلائیں، لوگوں تک اس کی باتوں کو پہنچائیں، خاص طور سے جو حضرات جاننے والے ہیں اور

واقف ہیں، جو قرآن مجید کے پیغام کو سمجھتے ہیں، قرآن مجید ہم سے جو زندگی چاہتا ہے، ان باتوں کو جو لوگ خوب جانتے ہیں ان کی بڑی ذمہ داری ہے کہ وہ دوسروں تک بات پہنچائیں۔ باقی یہ قرآن مجید کی خصوصیت ہے جو شاید ہمیں کسی اور جگہ نہ ملے کہ ہر دور کے لیے اللہ نے اس میں رہنمائی کا سامان رکھا ہے، لیکن اس کو سمجھنا ایسی چیز ہے جو ہر ایک کو حاصل نہیں ہوتی، اس کا فہم اسی کو حاصل ہوتا ہے جو خود کو سیرت وسنت سے وابستہ کرتا ہے، جو قرآن مجید کی تشریح اللہ کے نبی ﷺ کی مبارک زندگی اور آپ کے ارشادات کو سامنے رکھ کر کرتا ہے، اس کو قرآن مجید کا صحیح فہم حاصل ہوتا ہے۔

یاد رکھئے! قرآن مجید کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ مختلف آنے والے زمانوں میں ہمیشہ رہنمائی کرے گا، اس کے پیچھے ہمیں سنت کی وہ رہنمائی ساتھ ساتھ ملے گی اور اس کی تشریح ملے گی جس کے ذریعہ سے ہم اپنی صحیح منزل تک پہنچ سکتے ہیں، اگر وہ چیز سامنے نہیں ہے تو آدمی کہیں نہ کہیں دھوکہ ضرور کھائے گا، اس دور میں جو نئی ترقیات ہو رہی ہیں اور دنیا آسمان پر پہنچ رہی ہے، بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ لوگوں کے ذہن ودماغ میں یہ بات آجاتی ہے کہ اب ہمیں کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے، قرآن مجید ہمارے لیے کافی ہے، اگر کوئی یہ سمجھتا ہے تو یہ ہدایت کے منافی ہے اور خود قرآن مجید جو چاہتا ہے اس کے منافی ہے، قرآن مجید بار بار یہ کہتا ہے کہ آپ ﷺ جو کچھ فرماتے ہیں وہ برحق ہے، وہ بھی وحی الٰہی کا درجہ رکھتا ہے:

{وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ★ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ} (النجم: ۴-۳) (اور وہ خواہش سے نہیں کہتے، وہ تو صرف وحی ہے جو ان پر کی جاتی ہے)۔

اسی لیے یہ بات کہی جاتی ہے کہ کلام الٰہی ''وحی متلو'' ہے، اس کا ایک ایک حرف اللہ کی طرف سے نازل کردہ ہے، اس کی تلاوت عبادت ہے اور اس کو بغیر طہارت کے چھونا درست نہیں، لیکن ایک ''وحی غیر متلو'' ہے یعنی اللہ کے نبی ﷺ کی سیرت اور آپ کی حدیثیں جو اللہ نے آپ کے قلب اطہر پر مضامین اتارے، آپ نے ان کو اپنی زبان مبارک سے ادا فرمایا، ان کو حدیث کہتے ہیں، ظاہر ہے کہ آپ اپنی مرضی سے کچھ نہیں کہتے تھے، اللہ کی طرف سے ہوتا تھا، آپ اپنی طرف سے کہتے تھے اور اللہ کی طرف سے تائید ہوتی تھی اور اگر کبھی کوئی ایسی بات ہوئی تو اللہ کی طرف سے حکم آجاتا تھا کہ ایسا ہونا ہے، تو آپ ﷺ نے جو فرمایا وہ بھی وحی الٰہی ہی کا درجہ رکھتا ہے، اللہ نے اس کی تائید فرمائی اور اگر کبھی کچھ ضرورت پڑی تو بات واضح فرمادی، اس لیے یقین کرنا چاہیے کہ جس طرح یہ وحی الٰہی ہے، اسی طرح سے حدیثیں اور آپ ﷺ کی سنت بھی وحی الٰہی کا درجہ رکھتی ہے، بس فرق اتنا ہے کہ قرآن وحی متلو ہے اور حدیث وحی غیر متلو ہے، قرآن کا ایک ایک حرف، ایک ایک نقطہ منزل من اللہ ہے اور آج تک اسی طرح محفوظ ہے اور قیامت تک محفوظ رہے گا، حدیثوں کو یہ خصوصیت حاصل نہیں ہے، حدیثوں میں بہت سی حدیثیں متواتر ہیں اور بہت سی وہ ہیں جن کے اندر بعد کے راویوں کی وجہ سے کمزوری پیدا ہوئی، بہت سی حدیثیں وہ ہیں جو لوگوں نے گڑھ لیں اور ان کو بھی حدیث کہہ دیا گیا، یہ ایک بڑا فرق ہے۔

قرآن مجید میں شک وشبہ کا کوئی احتمال نہیں لیکن حدیثوں میں ہمیں تحقیق کی ضرورت پڑتی ہے کہ حدیث کس درجہ کی ہے؟ نقل کرنے والا کون ہے اور اس کا مقصد کیا ہے؟ اس کی زندگی کیسی ہے؟ اس پر علماء نے ایسی محنت اور ایسی جاں فشانی اختیار کی ہے کہ اس کا اعتراف مستشرقین نے کیا، حدیثوں کے نقل کرنے والے پانچ لاکھ رواۃ کی زندگی اور ان کے حالات محفوظ کردیئے گئے، یہ اس امت مسلمہ کا ایک کارنامہ ہے، اس سے پہلے اس کا کوئی تصور نہیں تھا، بلکہ اگر میں یہ کہوں کہ علم تاریخ اور علم رجال کا وجود حقیقت میں اسی حدیث وسنت کا فیض ہے، روایت کرنے والوں کی وجہ سے اس تحقیق کی ضرورت پڑی، ورنہ شاید اتنی محنت اس سلسلہ میں نہ ہوتی۔

اس دور کے فتنے اتنے زیادہ ہیں اور لوگ گمراہی کی طرف جاتے ہیں، اس لیے اس وضاحت کی ضرورت سمجھی گئی کہ قرآن مجید کا فہم احادیث وسیرت سے جڑا ہوا ہے، اس کے مطابق جب فہم قرآن ہوگا تو وہی اصل فہم قرآن ہے اور وہی قرآن کی دعوت ہے، یہی قرآن کہتا ہے کہ قرآن کو اسی طرح سمجھو جس طرح اللہ کے نبی نے سمجھایا، آپ جس طرح وضاحت کریں گے وہی اصل ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ بات فرمائی ہے کہ {وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ} (النحل: ۴۴) (اور ہم نے (کتاب) نصیحت آپ پر اس لیے اتاری تاکہ آپ لوگوں کے لیے ان چیزوں کو کھول دیں جو ان کی طرف اتاری گئی ہیں اور شاید وہ غور کریں۔)

واقعہ یہ ہے کہ بہت سی چیزیں قرآن مجید میں ایسی ہیں کہ اگر آپ وضاحت نہ فرماتے تو شاید ہم ان کو نہیں سمجھ سکتے تھے۔

قرآن مجید کی بعض آیتیں وہ بھی ہیں جن کو متشابہات کہا جاتا ہے، خود قرآن مجید میں اس کا ذکر ہے:

{هُوَ الَّذِىَ أَنزَلَ عَلَيْکَ الْكِتَابَ مِنْهُ آيَاتٌ مُّحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ وَأُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ فَأَمَّا الَّذِيْنَ فِىْ قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَأْوِيْلِهِ وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيْلَهُ إِلاَّ اللّهُ وَالرَّاسِخُونَ فِىْ الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ كُلٌّ مِّنْ عِندِ رَبِّنَا} (آل عمران:۷)

(وہی ہے جس نے آپ پر کتاب اتاری، اس میں محکم آیتیں ہیں، وہی کتاب کی اصل ہیں اور دوسری آیتیں متشابہ ہیں تو جن لوگوں کے دلوں میں ٹیڑھ ہے وہ متشابہ آیات کے پیچھے لگتے ہیں فتنہ کی خواہش میں اور اس کے (غلط) مطلب جاننے کی تلاش میں، جب کہ اس کا مطلب صرف اللہ ہی جانتا ہے اور پختہ علم رکھنے والے کہتے ہیں ہم ان پر ایمان لائے اور سب ہی ہمارے رب کی طرف سے ہے۔)

کہا گیا کہ دو طرح کی آیتیں ہیں، اصل وہی ہیں جو محکمات ہیں اور بعض آیتیں متشابہات ہیں، اہل علم کا کام یہ ہے کہ جو محکمات ہیں ان پر عمل کریں، ان کو سمجھیں اور آگے بڑھیں اور جو متشابہات ہیں ان کے چکر میں نہ پڑیں، جتنا بتا دیا گیا، اگر اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کچھ بتا دیا تو اس پر ہمیں ایمان رکھنا ہے، اس پر یقین کرنا ہے اور اپنی زندگی اس کے مطابق بنانی ہے، باقی جتنی بھی آیتیں ان پر ہمارا ایمان ہو کہ یہ اللہ کا کلام ہے مثلاً: {الٓمٓ} کہا گیا تو اس کا کیا مطلب ہے؟ کیا اس کا صحیح مطلب کوئی آج تک سمجھ سکا ہے، اس کی تاویلیں کی گئیں، لیکن اصل یہی ہے کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ یہ لفظ بھی جو اللہ نے اتارا یہ اللہ کا کلام ہے اور اس کی خاص مصلحتیں ہیں۔

نعتِ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

ادیب الرحمٰن غزالی ندوی (کتب خانہ علامہ شبلی نعمانی، ندوۃ العلماء لکھنؤ)

جانِ جاں جانِ جہاں، جانِ وفا کی شان میں
زندگی سو سو فدا اک اک ادا کی شان میں

انتہا ہے عظمت و رفعت کی شان مصطفی
ہے شرف معراج محبوبِ خدا کی شان میں

دست بستہ تھے شب معراج استقبال کو
حور و غلمان و ملائک مصطفی کی شان میں

وجد میں نغمے درود پاک کے ہونٹوں پہ ہیں
اور زباں پر نعت ہے صل علیٰ کی شان میں

حسن یوسف یا دم عیسیٰ ید بیضا لکھوں
سوچتا ہوں کیا لکھوں میں مصطفی کی شان میں

جل اٹھی شمعِ ہدایت چھٹ گئیں تاریکیاں
رونقِ دنیا بڑھی بدرالدجیٰ کی شان میں

دین و ایمان و شریعت اور ہدایت کی کتاب
راستے روشن ہیں سارے رہنما کی شان میں

ثور کی منزل کے غم ہوں یا ہوں ہجرت کے الم
ہر قدم صدیقیت صدق و صفا کی شان میں

عظمتِ فاروق ہے یہ، دست بستہ آپؐ نے
مانگا ہے ایمان اس مردِ خدا کی شان میں

ہے سخاوت کے لبوں پر نامِ عثمان غنیؓ
تذکرے جب جب ہوئے جود و سخا کی شان میں

ہیں وہ داماد پیمبر فاتحِ خیبر بھی ہیں
لفظ مولیٰ ہے فضیلت مرتضیٰ کی شان میں

آئی جب یادِ خدیجہؓ مونس و غمخوار کی
رو دئے ہیں آپؐ بھی اس با وفا کی شان میں

گنبد خضری وہ روضے کی سنہری جالیاں
ہو بیاں توصیف کیا جنت نما کی شان میں

کتنا عالی ہے غزالی رتبۂ خیرالبشر
اترا ہے قرآن اس خیرالوریٰ کی شان میں

تعلیم الحدیث

پروردگارِ بے نیاز کی صدائے بندہ نواز

عبدالرشید راجستھانی ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء)

عن أبي ذرٍّ الغِفاريّ رضي الله عنه، عنِ النَّبيِّ ﷺ فيما يَرويهِ عن ربِّه عزَّ وجلَّ أنّه قال"يَا عِبَادِي، إِنِّي حَرَّمْتُ الظُّلْمَ عَلَى نَفْسِي، وَجَعَلْتُهُ بَيْنَكُمْ مُحَرَّمًا فَلَا تَظَالَمُوا. يَا عِبَادِي، كُلُّكُمْ ضَالٌّ إِلَّا مَنْ هَدَيْتُهُ، فَاسْتَهْدُونِي أَهْدِكُمْ. يَا عِبَادِي، كُلُّكُمْ جَائِعٌ إِلَّا مَنْ أَطْعَمْتُهُ، فَاسْتَطْعِمُونِي أُطْعِمْكُمْ. يَا عِبَادِي، كُلُّكُمْ عَارٍ إِلَّا مَنْ كَسَوْتُهُ، فَاسْتَكْسُونِي أَكْسُكُمْ. يَا عِبَادِي، إِنَّكُمْ تُخْطِئُونَ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ، وَأَنَا أَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا، فَاسْتَغْفِرُونِي أَغْفِرْ لَكُمْ. يَا عِبَادِي، إِنَّكُمْ لَنْ تَبْلُغُوا ضَرِّي فَتَضُرُّونِي، وَلَنْ تَبْلُغُوا نَفْعِي فَتَنْفَعُونِي. يَا عِبَادِي، لَوْ أَنَّ أَوَّلَكُمْ وَآخِرَكُمْ، وَإِنْسَكُمْ وَجِنَّكُمْ، كَانُوا عَلَى أَتْقَى قَلْبِ رَجُلٍ وَاحِدٍ مِنْكُمْ، مَا زَادَ ذَلِكَ فِي مُلْكِي شَيْئًا. يَا عِبَادِي، لَوْ أَنَّ أَوَّلَكُمْ وَآخِرَكُمْ، وَإِنْسَكُمْ وَجِنَّكُمْ، كَانُوا عَلَى أَفْجَرِ قَلْبِ رَجُلٍ وَاحِدٍ مِنْكُمْ، مَا نَقَصَ ذَلِكَ مِنْ مُلْكِي شَيْئًا. يَا عِبَادِي، لَوْ أَنَّ أَوَّلَكُمْ وَآخِرَكُمْ، وَإِنْسَكُمْ وَجِنَّكُمْ، قَامُوا فِي صَعِيدٍ وَاحِدٍ، فَسَأَلُونِي، فَأَعْطَيْتُ كُلَّ إِنْسَانٍ مَسْأَلَتَهُ، مَا نَقَصَ ذَلِكَ مِمَّا عِنْدِي إِلَّا كَمَا يَنْقُصُ الْمِخْيَطُ إِذَا أُدْخِلَ الْبَحْرَ. يَا عِبَادِي، إِنَّمَا هِيَ أَعْمَالُكُمْ أُحْصِيهَا لَكُمْ، ثُمَّ أُوَفِّيكُمْ إِيَّاهَا، فَمَنْ وَجَدَ خَيْرًا فَلْيَحْمَدِ اللهَ، وَمَنْ وَجَدَ غَيْرَ ذَلِكَ فَلَا يَلُومَنَّ إِلَّا نَفْسَهُ". (مسلم:۲۵۷۷)

ترجمہ:

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے رب عزو جل کا ارشاد نقل فرمایا: اے میرے بندو! میں نے ظلم کو اپنی ذات پر حرام کر دیا ہے اور تمہارے درمیان بھی اسے حرام کر دیا ہے، لہٰذا تم ایک دوسرے پر ظلم نہ کرو۔ اے میرے بندو! تم سب گمراہ ہو سوائے اُس کے جسے میں ہدایت دوں، پس تم مجھ سے ہدایت مانگو، میں تمہیں ہدایت دوں گا۔ اے میرے بندو! تم سب بھوکے ہو سوائے اُس کے جسے میں کھلاؤں، پس تم مجھ سے کھانا مانگو، میں تمہیں کھلاؤں گا۔ اے میرے بندو! تم سب ننگے ہو سوائے اُس کے جسے میں لباس پہناؤں، پس تم مجھ سے لباس مانگو، میں تمہیں لباس دوں گا۔ اے میرے بندو! تم رات دن گناہ کرتے رہتے ہو اور میں ہی ہوں جو سب گناہوں کو معاف کرتا ہوں، پس تم مجھ سے مغفرت مانگو، میں تمہیں بخش دوں گا۔ اے میرے بندو! تم ہرگز اس طاقت کو نہیں پہنچ سکتے کہ مجھے نقصان پہنچا سکو، اور نہ اس حیثیت تک پہنچ سکتے ہو کہ مجھے نفع دے سکو۔ اے میرے بندو! اگر تمہارے اول سے آخر تک، انسان اور جن سب کے سب ایک ایسے شخص کے دل جیسے ہو جائیں جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو، تو اس سے میری بادشاہت میں کچھ بھی اضافہ نہ ہوگا۔ اے میرے بندو! اور اگر تمہارے اول سے آخر تک، انسان اور جن سب کے سب ایک ایسے شخص کے دل جیسے ہو جائیں جو سب سے زیادہ بدکار ہو، تو اس سے میری بادشاہت میں کچھ بھی کمی نہ ہوگی۔ اے میرے بندو! اگر تمہارے اول سے آخر تک، انسان اور جن سب کے سب ایک ہی میدان میں کھڑے ہو کر مجھ سے مانگیں اور میں ہر ایک کو اس کی مانگی ہوئی چیز عطا کر دوں، تو میرے خزانے میں بھی کوئی کمی نہ ہوگی جیسا کہ سوئی کو سمندر میں ڈبونے سے پانی میں کوئی کمی نہیں ہوتی ہے۔ اے میرے بندو! یہ تمہارے ہی اعمال ہیں جنہیں میں تمہارے لیے محفوظ کرتا ہوں، پھر میں تمہیں اُن کا پورا پورا صلہ دیتا ہوں۔ پس جسے خیر ملے وہ اللہ کا شکر ادا کرے، اور جسے اس کے سوا کچھ ملے یعنی برائی تو وہ اپنے سوا کسی کو ملامت نہ کرے۔

فضیلت حدیث:

یہ حدیث قدسی علماء کے نزدیک نہایت بلند مرتبہ اور عظمت والی ہے۔ تابعی بزرگ حضرت ابو ادریس خولانی رحمہ اللہ اس حدیث کو جس وقت بیان کرتے تو گھٹنوں کے بل بیٹھ جاتے اور نہایت خشوع وعاجزی کے ساتھ سناتے۔ (صحیح مسلم)

امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ یہ شامی راویوں سے منقول روایتوں میں سب سے اعلیٰ و ارفع اور عظیم حدیث ہے، شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اس کو بے حد عظیم الشان قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ یہ حدیث دین کی بنیادوں، عقائد اور اعمال، اصول اور فروع سب کو اپنے دامن میں سمیٹتی ہے اور عدل کو دین کی اساس قرار دیتی ہے۔ (مجموع الفتاویٰ: ۱۸/ ۱۵۷)

امام نووی رحمہ اللہ نے اس کو کتاب الاذکار کے آخر میں اپنی سند سے نقل کرنے کے بعد فرمایا: ''یہ حدیث صحیح ہے، ہم نے اسے صحیح مسلم اور دیگر کتب میں روایت کیا ہے۔ اس کی سند میں مجھ سے لے کر حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ تک جتنے بھی راوی ہیں، سب کے سب شامی (دمشقی) ہیں۔ اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ بھی دمشق تشریف لے گئے تھے۔ اس حدیث میں کئی پہلوؤں سے اہم فائدے جمع ہیں: سب سے پہلے تو اس کی سند اور متن دونوں کی صحت، اور سند کا بلند ہونا اور دمشق کے راویوں کا مسلسل ہونا۔ پھر یہ کہ اس میں دین کے اصول و فروع اور آداب و اخلاق کے عظیم قواعد کو نہایت وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ اور ساتھ ہی دلوں پر اثر ڈالنے والے مواعظ اور لطیف اشاروں پر مشتمل ہے۔''

فوائد حدیث:

ظلم کی حرمت اور عدل کی بنیاد:

اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے فرمایا کہ میں نے ظلم کو اپنی ذات پر حرام کر دیا ہے اور تمہارے درمیان بھی ظلم کو حرام کر دیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ظلم بڑا گناہ اور ہلاکت کا سبب ہے۔ لہٰذا یہ حدیث انسان کو عدل و انصاف کی تعلیم دیتی ہے، اور ظلم سے بچنے کی تلقین کرتی ہے۔

اسی حقیقت کو قرآن کریم نے بھی نہایت جامع انداز میں بیان فرمایا:

﴿وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤی اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ہُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی﴾ (المائدہ: 8)

ترجمہ: اور کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس پر آمادہ نہ کرے کہ انصاف نہ کرو، انصاف کرو، یہی تقویٰ کے زیادہ قریب ہے۔

بندوں کی حاجت اور اللہ کی بے نیازی:

اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا کہ تم سب گمراہ ہو سوائے اس کے جسے میں ہدایت دوں، تم سب بھوکے ہو سوائے اس کے جسے میں کھلاؤں، اور تم سب ننگے ہو سوائے اس کے جسے میں لباس عطا کروں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی ذات میں کسی چیز کا مالک نہیں، ہر ضرورت اور ہر خیر صرف اللہ کے پاس ہے۔ بندہ اسی سے مانگے، اسی پر بھروسہ کرے۔ یہ توحیدِ عملی اور کامل توکل کی تعلیم ہے۔

اللہ کی مغفرت اور بندے کی خطائیں:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم رات دن گناہ کرتے رہتے ہو اور میں ہی ہوں جو سارے گناہ معاف کرتا ہوں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ کی مغفرت کی وسعت لامحدود ہے، وہ ہر وقت توبہ قبول کرتا ہے۔ بندے کے لیے اس میں امید اور رجوع کی دعوت ہے کہ مایوس نہ ہو بلکہ ہر وقت استغفار کرتا رہے۔

اللہ کی قدرت کاملہ اور بندے کی عاجزی:

اس حدیث میں بتایا گیا کہ تمہاری نافرمانی سے اللہ کو نقصان نہیں پہنچ سکتا اور نہ تمہاری فرمانبرداری سے اللہ کو کوئی فائدہ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اپنی ذات میں کامل اور بے نیاز ہے۔ بندوں کی اطاعت اور معصیت کا نفع اور نقصان صرف انہی کو پہنچتا ہے۔

سب کے اعمال اللہ کے علم میں ہیں:

حدیث کے آخر میں فرمایا کہ یہ تمہارے ہی اعمال ہیں جنہیں میں نوٹ کرتا ہوں اور پھر پورا بدلہ دیتا ہوں۔ اس سے بندے کو محاسبۂ نفس اور نیک عمل کی ترغیب ملتی ہے کیونکہ جو کچھ وہ کرے گا اس کا پورا بدلہ پائے گا۔ اگر نیکی کرے گا تو اس کے لئے شکر کا مقام ہوگا، اور اگر برائی کرے گا تو مورد ملامت خود بنے گا۔

اللہ کی شان اور کائنات کی بے وزنی:

اس میں یہ بھی بیان ہوا کہ اگر سب انسان اور جن ایک شخص کی طرح سب سے زیادہ پرہیزگار ہو جائیں تو اللہ کی بادشاہی میں کچھ اضافہ نہ ہوگا، اور اگر سب ایک شخص کی طرح سب سے زیادہ بدکار ہو جائیں تو اللہ کی بادشاہی میں کچھ کمی نہ ہوگی۔ اس سے اللہ تعالیٰ کی عظمت اور مخلوق کی بے اثری کھل کر سامنے آتی ہے۔

خلاصۂ حدیث:

یہ حدیث ہمیں بتاتی ہے کہ انسان ہر حال میں اللہ کا محتاج ہے، اس کی ہدایت، اس کا رزق، اس کی مغفرت ہی اصل سہارا ہے، بندے کا فرض ہے کہ ہر حال میں اسی کی طرف رجوع کرے، اسی سے مانگے، اسی پر بھروسہ کرے اور اپنے اعمال کی جواب دہی کو ہر وقت سامنے رکھے، اس طرح یہ حدیث بندے کو حقیقی توحید کا سبق دیتی ہے کہ ہر خیر و ہدایت کا سرچشمہ صرف اللہ ہے، اسی پر اعتماد اور اسی سے امید رکھنا ایمان کی روح ہے۔

یہ حدیث بندے کو عاجزی، شکر گزاری اور محاسبۂ نفس کی عملی دعوت دیتی ہے۔ اے بے نیاز رب! ہم تیرے محتاج اور خطاکار بندے ہیں، ہمیں اپنی ہدایت سے محروم نہ کر، ہمارے دلوں کو گناہوں سے پاک اور تیری محبت سے سرشار کر دے، اور ہمیں دنیا و آخرت میں اپنی رحمت اور قرب نصیب فرما۔ آمین یا رب العالمین!

فقہی مسائل

سوال و جواب

مفتی محمد ظفر عالم ندوی (استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء)

سوال: تعلیم یافتہ خواتین کا ایک طبقہ لبرل نظریہ رکھتا ہے اور مرد حضرات کے ساتھ سماجی اور ثقافتی پروگرام کرتا ہے اور اس کو ایک قدیم ترقی کی طرف بڑھنا تصور کرتا ہے، کیا مرد و خواتین کا ایک ہال میں جمع ہونا جائز ہے؟

جواب: اختلاط کے ساتھ مسلم مرد اور خواتین کا ایک ہال میں جمع ہونا جائز نہیں ہے، البتہ اگر مناسب پردہ کا انتظام ہو، خواتین اور مردوں میں فاصلہ ہو کہ ایک دوسرے کو نہ دیکھ سکیں، تو ایسے ہال میں جمع ہونا جائز ہے۔

ابو داؤد شریف کی ایک روایت ہے:

''حضرت ابو اسید انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس وقت فرماتے ہوئے سنا جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد سے باہر نکل رہے تھے اور لوگ راستے میں عورتوں سے مل جل گئے تھے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں سے فرمایا: تم پیچھے ہٹ جاؤ تمہارے لیے راستے کے درمیان سے چلنا ٹھیک نہیں ہے، تمہارے لیے راستے کے کنارہ کنارہ چلنا مناسب ہے، پھر ایسا ہو گیا کہ عورتیں دیوار سے چپک کر چلنے لگی، یہاں تک کہ ان کے کپڑے دیوار میں پھنس جاتے تھے۔ [سنن ابو داؤد: حدیث نمبر 5272]

سوال: جو اشیاء ہندوؤں کے یہاں پوجا پاٹ اور تہوار میں استعمال ہوتی ہیں، مسلمانوں کے لیے ان اشیاء کا کاروبار کرنا کیسا ہے؟

جواب: غیر مسلموں کی پوجا پاٹ میں جو چیزیں استعمال ہوتی ہیں، وہ پوجا کے علاوہ دوسرے جائز مقاصد کے لیے بھی استعمال ہو سکتی ہیں، اس لیے فی نفسہ ایسی چیزیں جو پوجا پاٹ میں استعمال ہوتی ہیں جیسے پھول، مالا وغیرہ ان اشیاء کو بیچنے اور خریدنے میں کوئی حرج نہیں، البتہ جو لوگ ان اشیا کا استعمال کریں گے وہ خود اس کے گنہگار ہوں گے اور بیچنے والے سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوگا۔

سوال: بعض علاقوں میں میت کا جنازہ لے جانے کے بعد گھر میں خواتین اجتماعی دعا کرتی ہیں، کیا ایسا کرنا شرعاً درست ہے؟

جواب: لازم یا فضیلت کا کام سمجھتے ہوئے عورتوں کا میت لے جانے کے بعد اجتماعی دعا کرنے کا معمول بنانا کتاب و سنت سے ثابت نہ ہونے کی وجہ سے ناجائز اور قابل ترک ہے: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من أحدث في أمرنا هذا ما ليس فيه فهو رد۔ [صحیح بخاری 2697]

سوال: آج کل کم عمر اور خوبصورت نظر آنے کے لیے پلاسٹک سرجری کی جاتی ہے، کیا شرعاً ایسا کرنا جائز ہے؟

جواب: کم عمر اور خوبصورت نظر آنے کے لیے پلاسٹک سرجری کرانے کی شریعت میں اجازت نہیں ہے، کیونکہ حقیقی عمر سے کم عمر ظاہر کرنا دھوکہ ہے، جو شریعت میں حرام ہے اور خوبصورتی کے لیے گودنے، گودوانے، بال اکھاڑنے اور دانتوں کے درمیان کشادگی کرنے والی عورتوں پر احادیث میں لعنت کی گئی ہے: لعن الله الواشمات والمستوشمات والمتنمصات والمتفلجات للحسن المغيرات لخلق الله. [صحیح بخاری: 5948]

اس کے علاوہ پلاسٹک سرجری سے تغیر خلق اللہ بھی لازم آتی ہے، جس سے اس فعل کی تخلیق میں تبدیل کرنا اللہ کی شناخت میں اضافہ ہوتا ہے۔ ولآمرنهم فليغيرنّ خلق الله [سورہ النساء: 119]

سوال: ازالۂ عیب کے لیے جسم کے کسی حصہ کا گوشت دوسری جگہ لگانا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

جواب: ازالۂ عیب کے لیے مریض کا اپنے جسم کے کسی حصہ کا گوشت، چمڑا یا ہڈی کا استعمال جب کہ مریض کے لیے اس کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہ ہو، شرعاً جائز ہے، کیونکہ فقہاء نے مریض کے اپنے جسم کے کسی حصے سے انتفاع کی اجازت دی ہے، البتہ اس جواز کے لیے شرط یہ ہے کہ دوسری جگہ سے گوشت، چمڑا یا ہڈی وغیرہ لینے میں اس عضو کے ناکارہ ہونے یا غیر معمولی نقصان کا اندیشہ نہ ہو۔ [فتاویٰ ہندیہ: 5/360]

سوال: میڈیکل اسٹور کھولنے کے لیے لائسنس کرایہ پر حاصل کرنا اور دینا کیسا ہے؟

جواب: کسی کے میڈیکل لائسنس کرایہ پر لے کر میڈیکل اسٹور کھولنا چونکہ قانونی جرم ہے اور یہ دھوکہ دہی میں شامل ہے اور ملکی قانون کی بھی خلاف ورزی ہے، بسا اوقات سزا بھی ہو جاتی ہے، اس طرح اپنے کو ذلیل کرنا ہوگا، اس لیے یہ شرعاً جائز نہیں ہے۔ ولا يسمح القانون بنقلها إلى رجل آخر أو شركة أخرى، فلا شبهة في عدم جواز بيعها، لأن بيعها يؤدي حينئذ إلى الكذب والخديعة۔ [بحوث في قضايا فقهية معاصرة. ص115]

راہِ عمل

نبوت کا پیغام اور ہر زمانہ میں اس کی ضرورت

مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی مدظلہ

اس ترقی پذیر عہد کو جس میں انسان نے علم و صنعت اور تہذیب وتمدن کے ہر شعبہ میں عظیم ترقی کی ہے اور کامیابی کی بلند منازل کو طے کیا ہے، ایک روشن دور کہا جاسکتا ہے، بلاشبہ یہ وقفہ جس کو ہم بیسویں صدی کہتے ہیں، تاریخ کے ان اہم ترین وقفوں میں شمار کیا جاسکتا ہے جو انسانی عزم وہمت اور فتح وکامیابی کے آئینہ دار ہیں، اگر ہم غور کریں تو اس وقفہ میں انسانی دنیا نے جتنی ترقی کی ہے اور جیسے محیر العقول کارنامے اس میں انجام پذیر ہوئے ہیں، شاید تاریخ کا ہر دور اس سے خالی ہو، یہی وجہ ہے کہ اس کو ہم ہر اعتبار سے ایک ممتاز اور قابل فخر دور قرار دیتے ہیں۔

لیکن اگر ہم ان مادی ترقیات کا ایک سرسری جائزہ لے تو یہ بات بھی واضح ہوجائے گی کہ ترقی کی اس دوڑ اور اس میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے اور مسافت کے جوش میں ہمیں یہ بالکل یاد نہ رہا کہ ان ترقیات کا مقصد کیا ہے اور زندگی کو ان کے ذریعے کیا منافع حاصل ہوسکتے ہیں اور وہ کون سے حدود ہیں جن سے آگے نکل کر ہم بجائے فائدہ کے سراسر نقصان اور ہلاکت کا موجب بن جائیں گے، ہم نے اس مقابلہ میں قطعاً یہ یاد نہیں رکھا کہ ایٹم مفید ہونے کے ساتھ جب وہ جب وہ خطرناک اسلحہ کی شکل اختیار کرلے تو کس درجہ مہلک اور تباہیوں کا پیش خیمہ بن جاتا ہے۔

ترقی کے اس بے مقصد مقابلہ میں انسان نے خود اپنے ہاتھوں اپنی ہلاکت کا سامان تیار کیا اور دنیا کو ایک خطرناک جنگ کے دروازہ پر لاکھڑا کیا ہے جس کے نتیجے جس کے نتیجے میں عالمی امن کا نعرہ بلند ہوا اور وقتاً فوقتاً ہم نے کانفرنسوں کا انعقاد ناگزیر ہوکر رہ گیا، اب صورت یہ ہے کہ پوری دنیا اس خطرناک جنگ کو روکنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگارہی ہے، لیکن جنگ کے اس مہیب بادل کے سرچشمہ کو روکنے کی کسی کو فکر نہیں ہے، خطرناک اسلحہ اور ایٹمی ہتھیاروں کی صلاحیت روز بروز ترقی پذیر ہے، اور ہتھیار بنانے والے بڑے بڑے کارخانوں کی تاسیس کا سلسلہ جاری ہے۔

اس ترقی یافتہ اور روشن عہد میں انسانی عقل کا یہ تضاد کیوں رونما ہوا؟ یہ ایک سوال ہے جس کا مختصر جواب یہ ہوسکتا ہے کہ انسان نے اپنی ان ترقیت کے اندر عقل کی رہنمائی کے ساتھ ساتھ قلب کی رہنمائی نہیں حاصل کی اور اس سے مستغنی ہوکر اس نے اپنی تمام تر توجہات کو عقل کی رہنمائی پر مرکوز کردیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عقلی اعتبار سے تو وہ بہت اونچے مرتبہ پر پہنچ گیا، لیکن قلب و ضمیر کے اعتبار سے وہ بالکل صفر کے درجہ پر رہا۔

عقل و دل یا مادیت اور روحانیت کا یہ انفصال جب بھی کسی قوم میں رونما ہوتا ہے تو وہ اپنی انسانی خصوصیات کے اعتبار سے ناقص ہوتی ہے اور اس میں وہ تمام صفات نہیں موجود ہوتیں جو ایک سلیم الفطرت اور صاحب ضمیر قوم کے اندر ہونی چاہیے، عقل و دل کی یہ جدائی قوموں کو کبھی صحیح راہ پر نہیں چلاسکتی اور نہ ان کے اندر زندگی کا صحیح مقصد اور وہ انسانی جذبہ پیدا کرسکتی ہے جو زندگی کے سلبی پہلوؤں کو ختم کرکے ایجابی پہلو کو قوت پہنچاتا ہے۔

چھٹی صدی عیسوی دنیا کے لیے ایک فیصلہ کن زمانہ کیوں تھا؟ اس وقت انسانیت کیوں دم توڑ رہی تھی؟ اور قریب تھا کہ پوری کائنات فنا ہوجائے۔

اس سوال کا جواب بھی بالکل وہی ہے کہ اس زمانے کے انسان کو عقل کے ساتھ دل کی رہنمائی نہیں حاصل تھی، وہ عقلی اعتبار سے خواہ جس سطح پر بھی رہا ہو، لیکن قلبی اعتبار سے وہ انسانیت کے دائرے سے خارج تھا اور اس کی زندگی میں انسانی قلب وضمیر کے جو اوصاف ہونے چاہئیں، وہ نہیں تھے، انسانی معاشرہ میں جنگل کا قانون رائج تھا اور انسانی اخلاق کے بجائے درندوں اور جانوروں کے اوصاف کی حکمرانی تھی، زندگی ایک چوپائے کی طرح بے مقصد گزر رہی تھی، جنگ وجدال اور خوریز لڑائیوں کا بازار ہر طرف گھر میں تھا اور حالت اس قدر خراب ہوچکی تھی کہ اب عالم انسانیت کے باقی رہنے کا کوئی جواز نہیں رہ گیا تھا۔

لیکن اللہ تعالیٰ کی رحمت جوش میں آئی اور اس نے محض اپنے فضل وکرم سے نبی اکرم محمد رسول اللہ ﷺ کو رحمۃ للعالمین بنا کر مبعوث فرمایا، اس وقت دنیا کو ایک نئی زندگی ملی، انسانیت کو حیاتِ تازہ حاصل ہوئی اور انسان ایک دفعہ پھر صحیح معنوں میں انسان بن کر جلوہ آرائے سریر کائنات ہوا۔

نبی اکرم ﷺ اس دنیا میں جب نبی بن کر تشریف لائے تو آپ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے سب سے پہلا سبق جو بطور وحی نازل ہوا، اس میں انسان کو دعوتِ فکر دی گئی کہ وہ سوچے کہ آخر وہ کس طرح اس عالم وجود میں آیا، آنحضرت ﷺ نے بھی اس دعوت کو عام کیا اور انسان کو اپنے بارے میں سوچنے پر مجبور کیا۔

اور جب اس نے سوچا تو اس پر کائنات....

..........بقیہ صفحہ ۱۹/ پر

فرزندِ ندوہ

علم واحسان کا سنگم

مولانا ضیاء الحسن علوی ندویؒ

محمد اجمل فاروق ندوی

مولانا ضیاء الحسن علوی ندویؒ کاکوری کے ایک مشہور خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ اس خاندان کے بزرگوں نے ذاتی اصلاح و تزکیے کے لیے وقت کے مشائخ سے بھی تعلق رکھا، اعلیٰ تعلیمی و سماجی مراتب پر بھی فائز رہے اور دینی وملی خدمات میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے۔ اس خاندان کے ایک بزرگ منشی امتیاز علی کاکوروی اپنے شیخ ومرشد اویس زمانہ مولانا شاہ فضل رحمان گنج مرادآبادی کے حکم پر بڑا قانونی عہدہ چھوڑ کر ریاست بھوپال میں وزیر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ان کے عم زاد خان بہادر منشی اطہر علی کاکوروی انجمن تعلق داران اودھ کے مشیر قانونی بھی تھے اور اویس زمانہ کے دامن گرفتہ بھی۔ ندوۃ العلماء کے اولین محسنین میں بھی تھے۔ مولانا ضیاء الحسن علوی ندوی اسی عظیم المرتبت شخصیت کے بھتیجے تھے۔ ان کے والد گرامی کا نام منشی محسن علی کاکوروی تھا۔ وہ ۱۸۹۱ء میں پیدا ہوئے۔ سات سال کی عمر میں قرآن کریم مکمل کیا۔ فارسی و اردو کی ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کرنے کے بعد دس سال کی عمر میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخل کیے گئے۔ وہ ندوے میں داخلہ لینے والے اولین طالب علم تھے۔

مولانا ضیاء الحسن علوی ندوی کو علم و ادب اور روحانیت کا ماحول پشتینی طور پر ملا تھا۔ گھر میں آئے دن ملک کے عظیم صلحا واتقیا بھی تشریف فرما ہوتے تھے اور لکھنؤ کے اہم شعرا و ادبا بھی۔ ۱۹۰۵ء میں ندوے سے تعلیم مکمل ہوئی اور ۱۹۰۶ء میں دستار بندی ہوئی۔ یہ وہی جلسۂ دستار بندی ہے، جس میں اُن کے انتہائی بے تکلف دوست علامہ سید سلیمان ندوی کی دستار بندی بھی ہوئی تھی اور انھیں برجستہ عربی تقریر کے انعام میں علامہ شبلی نعمانی کا مبارک عمامہ حاصل ہوا تھا۔ مولانا ضیاء الحسن علوی نے اس جلسے میں اعجاز قرآن کے متعلق تقریر کی تھی۔ ایک نوجوان کی اعجاز قرآن جیسے ثقیل موضوع پر کی گئی تقریر اصحاب علم وفضل کے درمیان نہ صرف یہ کہ پسند کی گئی تھی بلکہ بعد میں مضمون کی شکل میں الندوۃ میں شائع بھی ہوئی تھی۔ کیونکہ انھوں نے روحانیت و ادب کا ماحول ابتدا ہی سے پایا تھا، اس لیے مولانا حفیظ اللہ بندولی، مولانا مفتی عبداللطیف رحمانی اور مولانا عبدالشکور فاروقی لکھنوی جیسے اساطین علم وفضل ان کے اساتذہ میں شامل تھے، لیکن انھوں نے امام المعقولات والادب مولانا محمد فاروق چریا کوٹی کا سب سے زیادہ اثر لیا تھا۔ اس لیے مولانا ضیاء الحسن علوی کو ادب ومعقولات سے سب سے زیادہ مناسبت رہی۔ آگے چل کر شمس العلماء علامہ شبلی نعمانی کے درس سے وابستہ ہوئے تو ان کی دلچسپی کے دونوں میدانوں کو مزید جلا ملی۔ ندوے سے تعلیم مکمل کر کے خود کو علامہ شبلی نعمانی سے استفادے اور لکھنؤ میں انگریزی تعلیم کے حصول کے لیے یکسو کرلیا۔ ۱۹۰۹ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں رہ کر ایم اے تک تعلیم حاصل کی۔ وہیں مشہور جرمن اسکالر پروفیسر یوسف ہارویز سے قریبی تعلقات کا موقع ملا۔ مولانا علوی نے اس موقعے کو غنیمت جان کر پروفیسر ہارویز سے جرمن اور عبرانی زبان کی بنیادی تعلیم بھی لی۔ ساتھ ہی ان سے استشراق کو بھی سمجھا۔ ۱۹۱۶ء میں یونیورسٹی سے فارغ ہوئے اور ۱۹۱۷ء میں حکومت اترپردیش کے زیرنگرانی عربی مدارس کے انسپکٹر مقرر ہوئے۔ اس اونچے عہدے سے سبک دوش ہونے سے کچھ پہلے ہی ۱۴؍جون ۱۹۴۵ء کو الہ آباد میں وفات پائی۔

مولانا ضیاء الحسن علوی ندوی کی تربیت میں سب سے اہم کردار علامہ شبلی نعمانی کا تھا۔ علامہ شبلی نعمانی کو جن تلامذہ سے خصوصی مناسبت اور امیدیں تھیں، ان میں ایک مولانا علوی بھی تھے۔ مکاتیب شبلی میں ان کے نام علامہ شبلی کے دس مکاتیب ہیں۔ ان سب مکاتیب میں موضوعات مختلف ہیں لیکن شاگرد سے محبت اور بے تکلفی کا پہلو ہر خط میں موجود ہے۔ کہیں حوصلہ افزائی ہے، کہیں مزید علم منتقل کرنے کی خواہش ہے، کہیں اپنے جاری علمی کاموں کی اطلاع ہے اور کہیں کوئی علمی

کام یا تعاون کرنے کا ہے۔ اسی طرح شاگرد بھی اپنے استاد کی عقیدت ومحبت اور اس کی رہنمائی میں زندگی کے مراحل طے کرنے کی طلب میں سرشار نظر آتا ہے۔ انھوں نے اپنی نا تمام آپ بیتی ''یاد ایام'' میں جگہ جگہ علامہ شبلی کا تذکرہ ہونے کے باوجو ''حضرت الاستاد علامہ شبلی نعمانی'' کا عنوان باندھا ہے اور اس کے تحت اپنے استاد ومحسن پر خوب صورت انداز میں چھے صفحات تحریر کیے ہیں۔ استاد کی رحلت کے بعد وہ اُن کے مشن کو آگے بڑھانے کی جدوجہد بھی کرتے رہے۔ علامہ سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ مولانا ضیاء الحسن علوی نے عربی نصاب اور اردو، فارسی و عربی کے سرکاری امتحانات کے نظام کو منظم اور مضبوط کرنے میں بڑی خدمت انجام دی ہے۔ انھوں نے علامہ شبلی نعمانی کے اصلاح نصاب کے خاکے کو ندوے سے آگے بڑھا کر پورے صوبۂ اتر پردیش میں رائج کر دیا۔ اسی طرح وہ دار المصنّفین کے مؤثر رکن بھی رہے۔ انھیں کی فرمائش پر مولانا عبد السلام ندوی نے معرکۃ الآرا کتاب ''امام رازی'' تصنیف فرمائی تھی۔ کتاب تیار ہوگئی تو اس پر مقدمہ لکھنے کے لیے علامہ سید سلیمان ندوی نے مولانا ضیاء الحسن علوی سے ہی گزارش کی تھی۔ افسوس اس سے پہلے ہی وہ دنیا سے رخصت ہوگئے۔

مولانا ضیاء الحسن علوی کاکوروی کو پشتینی طور پر تصوف وسلوک سے مناسبت تھی۔ وہ سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ کے دامن گرفتہ رہے۔ نوجوانی میں مولانا شاہ ابو احمد بھوپالی سے مرید رہے۔ اس نسبت سے مولانا شاہ ابوالخیر مجددی دہلوی کے ہاں بھی حاضری دیتے رہے۔ مرشد اول کی رحلت کے بعد حضرت شاہ نجم الدین فتح پوری سے مرید ہوئے۔ حضرت فتح پوری نے جب دار العلوم ندوۃ العلماء میں باقاعدہ تعلیم کا افتتاح کیا تھا، اس وقت بھی مولانا ضیاء الحسن علوی دس برس کے بچے کی حیثیت سے ان کے سامنے بیٹھے تھے اور علم الصیغہ کا کچھ حصہ پڑھا تھا۔ بزرگوں سے یہ وابستگی برائے نام نہیں عملی تھی۔ ذکر واذکار اور فکر واشغال کا اہتمام ان کی شخصیت کا لازمی عنصر تھا۔

مولانا ضیاء الحسن علوی ندوی نے کوئی مستقل کتاب تصنیف نہیں کی۔ ہاں وقتاً فوقتاً عالمانہ مضامین تحریر فرماتے رہے۔ ان میں سے کئی مضامین الندوہ کی فائلوں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ ان کے رفیق دیرینہ علامہ سید سلیمان ندوی کے مطابق ''عصر جدید کے اصلاحی مضامین بھی ہیں، جو کبھی ان کے نام سے اور کبھی بے نام چھپے۔'' جنگی جہازوں پر ایک شاندار مضمون علی گڑھ منتھلی میگزین میں بھی شائع ہوا تھا۔ علامہ شبلی نعمانی نے اسے بہت پسند فرمایا تھا اور انھیں انعام سے نوازا تھا۔ سید صاحب نے سبعہ معلقہ میں امراء القیس کے قصیدے کے اردو ترجمے اور الف لیلہ ولیلہ کے بڑے حصے کے اردو ترجمے کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ وہ شاعر بھی تھے۔ ضیاء تخلص تھا۔ حکیم نثار احمد علوی کی کتاب ''سخنوران کاکوری'' میں ان کا تذکرہ بھی ہے اور نمونے کے اشعار بھی۔ مولانا نے الندوۃ میں ''یاد ایام'' کے عنوان سے اپنے حالات لکھنے شروع کیے تھے۔ بعد میں یہ سلسلہ کتابی شکل میں الہ آباد سے شائع ہوا۔ اب تو نایاب بھی ہے۔ کتاب کیا ہے؟ لکھنؤ کی صاف ستھری نثر کا اعلیٰ نمونہ، لکھنوی تہذیب کا ایک دلکش نقش اور ندوۃ العلماء کی ابتدائی تاریخ کی مستند ترین دستاویز۔

مختصر یہ کہ مولانا ضیاء الحسن علوی کاکوروی ندوۃ العلماء کے لیے دار العلوم کے اولین طالب علم اور ندوے کی ابتدائی تاریخ کے عینی شاہد ہونے کی وجہ سے دستاویزی شخصیت کی حیثیت رکھتے تھے۔ اسی طرح علامہ شبلی نعمانی اور پروفیسر یوسف ہارویز کے تلمیذ خاص ہونے اور بیسویں صدی کے مشاہیرات کے صحبت یافتہ ہونے کی وجہ سے پوری علمی دنیا کے لیے تاریخی شخصیت کی حیثیت رکھتے تھے۔ گہرا علم، کتابوں اور شخصیتوں سے دائمی ربط اور اپنے میدان میں دین و ملت کی حتی الامکان کوشش کو ان کی زندگی کا خلاصہ کہا جاسکتا ہے۔ دن رات علم وحکمت کی مجالس اور سرکاری وغیر سرکاری مصروفیات کے باوجود ذکر وفکر کا پورا اہتمام آج کے اسکالرز اور اہلِ علم کے لیے روشن نمونہ پیش کرتا ہے۔ ضرورت ہے ایسے روشن چراغوں سے اکتساب نور کرنے اور مادیت کے اندھیروں میں ان سے روشنی حاصل کرنے کی۔

خیر امت

دعوتِ دین اور اس راہ کی آزمائشیں

پروفیسر محسن عثمانی ندوی

دین کی دعوت امت مسلمہ کی ذمے داری ہے، یہ ذمے داری وہ ہے جو اس امت مسلمہ کے کاندھے پر ڈالی گئی ہے۔ اس ذمے داری کو ادا نہ کرنے کی وجہ سے امت مسلمہ پر آفات وبلیات کا نزول ہوتا رہتا ہے۔ کم از کم اس راقم سطور کے نزدیک یہ پورا مسئلہ واضح ہے اور قرآن کی آیات سے ثابت ہے۔

پہلے قرآن کی اس آیت کو دیکھیے ”**وما خلقت الجن والإنس إلا لیعبدون**“ یعنی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ”میں نے تمام انس وجن کو اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔“ اس آیت سے انسانوں اور جنوں کی وجہ تخلیق معلوم ہوجاتی ہے اور وہ ہے اللہ کی عبادت۔ اس بات کو ذہن میں رکھیے، اس کے بعد تخلیق کائنات کے سلسلے میں اللہ کی پوری اسکیم کو نظر میں رکھیے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا اور ابلیس کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرے، یعنی اسے حضرت آدم کا ماتحت اور تابع دار ہونا تھا، کیوں کہ منشائے الٰہی کے اعلان اور اجراء ونفاذ کی ذمے داری اور عبادت کے پیغام کو پہنچانے کی ذمے داری حضرت آدم اور ان کی ذریت پر ڈالی جانے والی تھی۔ کیوں کہ مٹی ہی اس قابل تھی کہ اس مبارک بوجھ کو اٹھا سکے، بھڑکنے والی آگ میں اس بوجھ کے اٹھانے کی صلاحیت ہی نہ تھی۔ ’جن‘ وہ مخلوق تھی جسے آگ سے پیدا کیا گیا تھا۔ شیطان نے کہا تھا: **خلقتنی من نار وخلقته من طین**۔ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اس کو (یعنی آدم کو) مٹی سے۔ مٹی کا وصف تواضع وانکساری ہے، شیطان کو جب آدم کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا یعنی اطاعت کا تو اس نے سرتابی دکھائی اور حکم ماننے سے انکار کیا اور دھمکی دی کہ وہ آدم کی ذریت کو تا قیامت بہر طور گمراہ کرے گا اور گمراہ کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھے گا اور ہر سمت سے اسے گھیرے گا اور آدم کی ذریت کے لیے اس کے چنگل سے بچ نکلنا مشکل ہوجائے گا۔ یہ دھمکی دی تھی شیطان نے آدم کے خالق کو اور اس کائنات کے خالق یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ کو۔

تمام انس وجن کی تخلیق اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے ہوئی تھی، اس کے بعد انس وجن کو اس مقصد کی راہ دکھانے کا کیا انتظام کیا گیا۔ انتظام یہ کیا گیا کہ انبیاء کو سلسلہ وار اس دنیا میں بھیجا گیا، تاکہ اس روئے زمین پر اللہ کی عبادت واطاعت ہوتی رہے۔ دوسری طرف ابلیس کی ذریت نے بھی بنی نوع انسان کو گمراہ کرنے اور عبادت سے روکنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ خیر وشر کی کشمکش اور حق وباطل کی آویزش جاری رہی، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اب آخری پیغمبر بھیجا۔

اللہ تعالیٰ نے آدم کی ذریت کو شیطان کے کید سے بچانے کے لیے سیکڑوں ہزاروں کی تعداد میں پیغمبر بھیجے جو شیطان کے ورغلانے سے انسانوں کو نجات دلاتے تھے، تاکہ انسان توحید کے صحیح عقیدہ پر قائم رہے اور اللہ کی عبادت روئے زمین پر ہوتی رہے اور انسانوں اور جنوں کی جو وجہ تخلیق ہے وہ بھی پوری ہوتی رہے، اس میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو اور ہزاروں پیغمبروں کے آنے کا سلسلہ جاری رہا، یہ سلسلہ ہزاروں سال تک چلتا رہا، یہاں تک کہ آخری پیغمبر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث کیا گیا اور اس کے بعد پیغمبروں کے آنے کا سلسلہ بند ہوگیا، لیکن شیطان کی دھمکی تو باقی تھی، وہ تو ختم نہیں ہوئی۔ پیغمبروں کا سلسلہ رک گیا لیکن اللہ تعالیٰ نے اب ہدایت کی ذمے داری خیر امت کے سر پر ڈال دی، تاکہ انسان گمراہ نہ ہوں اور ہدایت کا سلسلہ دنیا میں جاری رہے:

(كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ) یعنی ”تم خیر امت ہو جسے بنی نوع انسان کے لیے مبعوث کیا گیا ہے، تم بھلائی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔“

اب قیامت تک کے لیے امت اور بنی نوع انسان کی ہدایت کی ذمے داری خیر امت کے سر پر ڈال دی گئی ہے، تاکہ روئے زمین پر اللہ کی عبادت ہوتی رہے اور انسانوں اور جنوں کے لیے جو کام وجہ تخلیق ہے وہ کام پورا ہوتا رہے۔

خیر امت پر اس چیز کی ذمے داری ڈالی گئی کہ خلق خدا صرف ایک اللہ کی عبادت کرے اور کسی دوسری مخلوق کی عبادت نہ کرے لیکن ہوا یہ کہ کچھ عرصہ بعد خیر امت کا تمغہ جس امت کو دیا گیا تھا، اس نے اس ذمے داری کو ادا کرنا چھوڑ دیا اور غیر اللہ کی عبادت کرنے لگے۔ حکم خداوندی سے سرتابی کے نتیجے میں اس امت پر آفات وبلیات کا نزول ہوتا رہا، لیکن یہ امت سمجھی ہی نہیں کہ مصائب کے بادل کیوں امنڈ امنڈ کر آرہے ہیں، یہ امت سمجھی ہی نہیں کہ بات کیا ہے، کیوں مسلمانوں کی حکومت ختم ہوگئی، کیوں انگریزوں کا اقتدار قائم ہوگیا، کیوں مسلم حکومتوں کے چراغ بجھادئے گئے، مسلم قوم دوسری ترکیبیں کرتی رہی اور نئے طریقے آزماتی رہی، جنگ آزادی کی ہل چل قائم رہی، جماعتوں پر

جماعتیں اور ادارے قائم کرتی رہی، مدرسے بھی قائم کیے جاتے رہے، کبھی مسلم بورڈ بنانے کا تجربہ ہوتا رہا، کبھی کوئی جماعت کبھی کوئی امارت، ہزاروں تنظیمیں ہزاروں نام، لیکن مسلمانوں کا کوئی مسئلہ حل نہیں ہوا، بلکہ مصائب وآلام کی شدت میں مزید اضافہ ہوتا گیا لیکن مسلمانوں کا ذہن ادھر منتقل نہیں ہوا کہ تمام آلام و مصائب کی اصل وجہ کیا ہے، دعوت سے دست بردار ہونے کی سزا یہ ملی کہ روز بروز حالات خراب ہوتے گئے اور اب دعوت کا نام لینے سے بھی لوگ ڈرنے لگے ہیں، لوگوں کو دعوت کے الزام میں قید کیا جاتا رہا، دار ورسن کی منزل جیسے قریب آگئی ہو۔

جب ایسے حالات پیش آئیں اور دعوت کا کام کرنے والوں کو تعذیب کا نشانہ بنایا جاتا ہے تو ایسے موقعے پر ہمارے سامنے صحابۂ کرام کے جو نمونے ہیں، ان کو سامنے لانے کی ضرورت ہوتی ہے اور قرآن کے واقعات کو بیان کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن خوف پھیلتا گیا اور خوف کا علاج نہیں ہوا۔ آج بھی خوف سے کوئی دعوت کا نام نہیں لیتا ہے۔

قرآن میں اصحاب الاخدود کے قصے کو بطور مثال پیش کیا گیا ہے کہ انہیں آگ کے الاؤ میں ڈال دیا گیا اور انھوں نے اس طرح جان دینی گوارا کر لی مگر دین سے نہ پھرے۔ ان کے واقعہ میں ہے کہ ایک عورت آگ میں جانے سے کترا رہی تھی۔ اللہ نے اس کے شیر خوار بچہ کو گویائی دے دی اور بچہ بول پڑا: امی صبر کرو آپ حق پر ہیں۔

حبیب بن زید انصاریؓ کا واقعہ ہے کہ مسیلمہ کذاب نے ان سے کہا کہ کیا تم گواہی دیتے ہو کہ محمد اللہ کے رسول ہیں۔ انھوں نے کہا ہاں۔ پھر اس نے کہا کیا تم گواہی دیتے ہو کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔ تو انھوں نے کہا۔ میں نہیں سنتا۔ وہ سوال کرتا جاتا اور ان کے جسم کا تھوڑا تھوڑا حصہ کاٹتا جاتا۔ لیکن وہ اپنے عقیدے پر قائم رہے اور ذرہ برابر مداہنت سے کام نہیں لیا۔

دورِ فاروقی میں عبداللہ بن حذافہ سہمیؓ کو ایک جنگ میں رومیوں نے قید کر لیا۔ انھیں شاہِ روم کے سامنے پیش کیا گیا۔ بادشاہ نے ان سے کہا تم نصرانی بن جاؤ، میں تم کو اپنی بادشاہت میں شریک کر لوں گا اور اپنی بیٹی سے تمہاری شادی کر دوں گا تو انھوں نے جواب دیا تم اگر پوری سلطنت دے دو اور عرب کی پوری ملکیت دے دو تو بھی میں دین محمدی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک لمحہ کے لیے بھی نہ پھروں گا۔ اس جواب کو سن کر بادشاہ نے دھمکی دی کہ میں تم کو قتل کر دوں گا۔ بولے تم جو چاہو کرو۔ اس کے بعد انھیں سولی پر لٹکا دیا گیا اور تیر انداز انھیں تیر مارنے لگے اور ساتھ ہی نصرانیت قبول کرنے کی ترغیب دیتے رہے۔ لیکن وہ انکار کرتے رہے۔ اس کے بعد بادشاہ نے ان کو سولی سے اتارنے کا حکم دیا۔ انھیں اتار دیا گیا پھر کیا ہوا ان کی نظروں کے سامنے ایک مسلمان قیدی کو لایا گیا اور اسے کھولتے پانی میں ڈال دیا گیا۔ دیکھتے دیکھتے اس کا گوشت ہڈیوں سے الگ ہو گیا۔ یہ دکھا کر حضرت عبداللہ سے کہا گیا۔ نصرانیت قبول کرو، ورنہ تمہارا بھی یہی حشر ہوگا۔ مگر وہ ذرہ برابر بھی متزلزل نہ ہوئے اور کسی نرمی کا مظاہرہ نہ کیا۔ اس کے بعد ان کو بھی کھولتے ہوئے پانی میں ڈالنے کے لیے اٹھایا گیا۔ اس وقت ان کی آنکھ سے آنسو نکل گئے یہ دیکھ کر بادشاہ کو خیال ہوا کہ اب یہ آدمی ڈر گیا ہے۔ لہٰذا نصرانیت قبول کرنے کے لیے آمادہ ہو جائے گا۔ فوراً حکم دیا کہ اس آدمی کو میرے پاس لایا جائے۔ وہ لائے گئے اور نصرانیت قبول کرنے کی بات دہرائی گئی، تو بھی ان کی کیفیت میں کسی طرح کی تبدیلی نہیں پائی۔ جب رونے کا سبب بادشاہ نے پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ میں صرف اس لیے رویا کہ میرے پاس ایک ہی جان ہے، جو اِس وقت ختم ہو جائے گی۔ اے کاش! میرے جسم میں جتنے بال ہیں اتنی ہی جانیں ہوتیں، جن کو فی سبیل اللہ یہ سزا دی جاتی۔ یہ جواب سن کر بادشاہ حیرت زدہ رہ گیا اور نہایت متاثر ہوا اور کہا کہ میرے سر کو تم بوسہ دو، میں تم کو آزاد کر دوں گا۔ حضرت عبداللہ نے کہا تمام مسلمان قیدیوں کو آزاد کر دو گے؟ بادشاہ نے کہا: ہاں! اس کے بعد انھوں نے اس کے سر کو بوسہ دیا اور سب مسلمان آزاد ہو گئے۔

عبداللہ بن حذافہؓ جب آئے تو بڑی گرم جوشی سے ان کا استقبال کیا گیا۔ حضرت عمر فاروقؓ نے کہا ہر مسلمان پر واجب ہے کہ وہ عبداللہ بن حذافہؓ کے سر کو بوسہ دے اور سب سے پہلے میں ان کو بوسہ دیتا ہوں۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ ایمان ویقین کی یہ کون سی منزل ہے جہاں ہمارے اسلاف پہنچے ہوئے تھے کہ حیرت میں ڈال دینے والے اعمال کا ان سے صدور ہوتا اور جان دے دینا ان کے لیے آسان تھا۔ حکمت اور مصلحت کے نام پر کوئی حیلہ بہانہ کرنے کے لیے آمادہ نہ ہوتے۔ رخصت، جواز اور گنجائش تلاش کرنے کے بجائے مشکلات اور خطرات کو جیسے خود دعوت دے رہے ہیں اور باطل کے مقابلے میں نرمی اور مداہنت کو غیرتِ ایمانی کے منافی سمجھتے تھے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ حبشہ کی جانب ہجرت کی نیت سے نکلے۔ ایک مقام برک غماد تک پہنچے تو قبیلۂ قارہ کا سردار ابن دغنہ ملا۔ اس نے پوچھا کہاں کے ارادے ہیں؟ حضرت صدیقؓ نے کہا: میری قوم نے مجھے نکال دیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ زمین میں جہاں چاہوں پھروں اور اپنے رب کی عبادت کروں۔ ابن دغنہ نے کہا آپ جیسا آدمی جو مصائب میں لوگوں کی مدد کرتا ہے، صلہ رحمی کرتا ہے، مجبور کا بوجھ اٹھاتا ہے، محتاج کی حاجت روائی کرتا ہے اور مہمان کی ضیافت کرتا ہے، اس کو کیسے نکالا جا سکتا ہے۔ آپ کو میں پناہ دیتا ہوں۔ اس کے بعد ابن دغنہ حضرت صدیقؓ کو مکہ واپس

لائے اور کہا کہ آپ یہاں اپنے رب کی عبادت کیجیے۔ ساتھ ہی ابن دغنہ نے پورے مکہ میں اعلان کر دیا کہ ابوبکرؓ کو میں نے پناہ دی ہے۔ یہ سن کر قریش نے کہا: ٹھیک ہے، لیکن ابوبکر سے کہو کہ اپنی نماز اور عبادت خاموشی سے ادا کریں۔ اعلان نہ کریں اور ہمیں تکلیف نہ دیں۔ اندیشہ ہے کہ ہمارے بچے اور عورتیں فتنہ میں پڑ جائیں گے۔ حضرت صدیقؓ اس طرح سے اپنے دن گزار رہے تھے۔ قریش کے بچے اور عورتیں حضرت کی قرأت سنتے، نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے، اس سے قریش کو پریشانی شروع ہوگئی اور بار بار ابن دغنہ سے شکایت کرنے لگے۔ آخرکار اس نے حضرت صدیقؓ سے کہہ دیا کہ اگر آپ خاموشی سے نہیں رہنا چاہتے تو میرا ذمہ واپس کر دو اور جہاں مرضی ہو چلے جاؤ۔ پھر کیا تھا بلا تامل حضرت صدیقؓ نے اس کا ذمہ واپس کر دیا اور کہا کہ مجھے اللہ تعالیٰ کی پناہ کافی ہے اور میں اس کی مرضی پر راضی برضا ہوں۔ ظاہر ہے ان کے لیے کوئی محفوظ مقام نہیں تھا۔ کوئی پناہ گاہ نہ تھی لیکن غیرت ایمانی نے کسی طرح کی بے مائیگی کا اظہار نہ کیا اور انہیں یہ برداشت نہ ہوا کہ محض سہولت و آسائش کی خاطر اہل مکہ کے خوف کو اپنے اوپر اثر انداز ہونے دیں اور حالات کے دباؤ کے تحت کوئی حکمت عملی اپنانے کے لیے آمادہ ہو جائیں۔

حضرت عمرؓ جب ایمان لائے تو لوگوں سے پوچھا کہ کسی بات کو بہت زیادہ عام کرنے والا کون ہو سکتا ہے؟ لوگوں نے بتایا جمیل بن عامر۔ حضرت فاروقؓ جمیل کے پاس گئے۔ اس سے کہا کہ تمہیں معلوم ہے کہ میں نے محمد کا دین قبول کر لیا ہے اور میں مسلمان ہو گیا ہوں؟ یہ سنتے ہی جمیل سیدھے خانۂ کعبہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہاں پہنچ کر خانۂ کعبہ کے دروازہ پر کھڑا ہو کر بلند آواز سے پکارا۔ قریش کے لوگو! تمہیں معلوم ہے ابن خطاب بے دین ہو گیا ہے۔ حضرت فاروقؓ بھی اس کے پیچھے تھے زوردار آواز میں بولے۔ اس نے جھوٹ کہا میں مسلمان بن گیا ہوں۔ یہ سنتے ہی کئی لوگ حضرت عمرؓ سے ہاتھا پائی کرنے لگے اور حضرت بھی اپنی مدافعت کرنے لگے۔ یہ سلسلہ دیر تک جاری رہا۔ حضرت اکیلے تھے، تھک کر بیٹھ گئے اور لوگ گھیرے ہوئے تھے۔ حضرت نے کہا اس وقت تم جو چاہو کر لو لیکن اگر ہم تین سو ہو گئے تو خدا کی قسم تمہاری مجال نہیں کہ تم کچھ کر سکو۔ یہ تنازعہ چل ہی رہا تھا کہ قریش کا ایک معمر آدمی آ گیا اور اس نے بیچ بچاؤ کرا دیا اور کہا کہ ایک آدمی نے اپنے لیے ایک چیز پسند کر لی ہے، اس کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ بنی عدی کے لوگ اپنے ایک آدمی کے ساتھ تمہارے اس سلوک کو گوارا کر لیں گے۔

حضرت فاروقؓ کے اس طرز عمل کی کیا توجیہ کی جائے۔ ہمارے ذہنوں میں دعوتی حکمت اور حکمت عملی کا جو تصور جما ہوا ہے اس سے اس طرز عمل کا کوئی میل نہیں ہے۔ ہمارا دانشور تو یہی کہے گا کہ یہ طرز فکر تو "آ بیل مجھے مار" کے مترادف ہے؛ لیکن صحیح بات یہ ہے کہ کسوٹی ہماری دانشوری اور حکمت عملی نہیں ہے بلکہ نمونۂ عمل سلف صالحین کے عمل کو ہی بنانا زیادہ صحیح ہے۔ اس اصول کے تحت ہم یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہیں کہ ایمان آگ کی ایک ایسی چنگاری ہے جو دیر تک راکھ میں دبی نہیں رہ سکتی۔ اور دبانے پر شعلہ بن جانے سے اسے کوئی چیز روک نہیں سکتی۔ ساتھ ہی یہ کہنا پڑتا ہے کہ ایمان و یقین کا جہاں عقل و خرد اور دانشوری کے جہاں سے بہت آگے ہے۔ شاید یہی بات ہے جو علامہ اقبالؒ کہنا چاہتے ہیں:

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

دیکھیے! ایک روز اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جمع ہیں۔ گفتگو چل رہی ہے کہ قریش نے ابھی قرآن نہیں سنا ہے، کون ہے جو ان کو سنانے کی ہمت کرے۔ عبداللہ بن مسعودؓ بول پڑے "میں"۔ ساتھیوں نے کہا تمہاری جان کو خطرہ ہے۔ اس کے لیے کسی ایسے آدمی کو اٹھنا چاہیے جس کے قبیلہ کے لوگ اس کی حفاظت کر سکیں۔ انھوں نے کہا چھوڑو یہ بات، میری حفاظت میرا اللہ کرے گا۔ اس کے بعد خانہ کعبہ کے قریب جا کر کھڑے ہوئے اور بسم اللہ کر کے "الرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْآنَ" پڑھنا شروع کر دیا۔ یہ دیکھ کر قریش کے لوگ ان پر ٹوٹ پڑے اور خوب خوب مارا۔ مار کھا کر جب وہ واپس آئے تو ساتھیوں نے کہا اسی چیز کا ہمیشہ اندیشہ تھا۔ انھوں نے کہا اس سے کیا ہوتا ہے۔ اگر تم چاہو تو کل میں پھر ان کو سناؤں گا۔ لوگوں نے کہا نہیں نہیں اتنا کافی ہے۔ گویا مار کھا کر، اذیت برداشت کر کے کافرانہ ذہنیت پر ضرب لگائی جا رہی ہے اور انسانی ضمیر کو بیدار کیا جا رہا ہے اور دعوت توحید کو عنوان بنایا جا رہا ہے۔ سوچنے کا ایک رخ یہ ہے۔ اور دوسرا رخ یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ ہم آہنگی پیدا ہو جائے اور باطل کو چھیڑا نہ جائے اور دعوت کا نام بھی نہ لیا جائے۔ ورنہ ماحول میں اضطراب پیدا ہوگا اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑے گا اور پھر دعوت کا موقع باقی نہ رہے گا۔ ان دونوں میں سے کون سا رخ صحیح ہے کون بتائے؟ ہم رات دن اپنے پیغمبر کا نام لیتے ہیں اور ان پر درود بھیجتے ہیں، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جب دعوت کے کام سے روکنے کی کوکی گئی تو انھوں نے کہا کہ خدا کی قسم! اگر لوگ میرے ایک ہاتھ پر سورج اور دوسرے پر چاند لا کر رکھ دیں گے تو بھی میں دعوت کے کام سے باز نہیں آؤں گا۔ قرآن میں دعوت کا حکم دیا گیا ہے، اب اس کے لیے دلیلوں کی ضرورت نہیں۔ بے شمار آیتیں ہیں جو دعوت کی فرضیت پر شاہد ہیں اور یہی اللہ کی نصرت ہے جس پر نصرت کا وعدہ کیا گیا ہے۔ قرآن کی آیت ذہن میں رکھیں کہ تمام انسانوں اور جنوں کا مقصد وجود اللہ کی عبادت ہے اور اسی کوشش کا نام

پیغمبرانہ مشن ہے، جس پر اللہ کی طرف سے نصرت کا وعدہ ہے: إن تنصروا الله ينصركم ويثبت أقدامكم، اگر کوئی شخص دعوت کے کام سے خوف زدہ ہے اور کہتا ہے کہ دعوت کے لیے ابھی حالات سازگار نہیں تو اسے اس میدان میں اترنے کی ضرورت نہیں اور نہ وہ نصرت خداوندی کا مستحق ہے۔

یہ قدم قدم بلائیں یہ سوادِ کوئے جاناں
جسے زندگی ہو پیاری وہ یہیں سے لوٹ جائے

یاد رکھیے! دعوت کے میدان میں اترنا اپنے آپ کو مقصد کائنات سے اور انسانوں اور جنوں کی تخلیق کے اس مقصد سے ہم آہنگ کرنا ہے، جس کا ذکر قرآن کریم میں آیا ہے اور اس کام پر اللہ کی نصرت نازل ہوتی ہے اور اس کام کے نہ کرنے پر آزمائشوں کا نزول بھی ہوتا ہے۔ آج اگر کچھ لوگ افتاں وخیزاں، پابہ جولاں پس زنداں لے جائے جارہے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی مدد نازل ہونے والی ہے، بشرطیکہ یہ کام جاری رہے۔ اگر یہ کام ملک میں نہیں ہوا تو ہر ادارہ، ہر جماعت، ہر امارت، ہر تنظیم اور ہر بورڈ کے لیے اس ملک میں ناکامی مقدر ہے۔

مسلمانوں کے ذہن پر کبھی اس خوف کا گزر نہیں ہونا چاہیے کہ ابھی ملک کے اندر حالات سازگار نہیں ہیں، اس لیے ابھی دعوت کی کامیابی کا کوئی امکان نہیں ہے۔ مسلمانوں نے بھی کئی سو سال اس ملک میں حکومت کی ہے۔ بالکل آخری مغلیہ دور میں ۱۸۳۰ء کے آس پاس مسلمان تقریباً ۱۶/ فیصد تھے اور انگریزوں کے دور اقتدار میں ۱۹۴۱ء میں مسلمانوں کی تعداد ۲۵/ فیصدی ہوگئی۔ یعنی ایک سو دس سالوں میں مسلمانوں کی آبادی میں تقریباً پچاس فیصد کا اضافہ ہوا ہے۔ ۱۶/ فیصد سے ۲۵/ فیصد تک وہ پہنچ گئے۔ یعنی مسلمانوں کی حکومت کے زمانے میں ۱۵-۱۶/ فیصد مسلمانوں کی آبادی تھی۔ انگریزوں کی حکومت کم وبیش نوے برس رہی اور بغیر کسی زور زبردستی کے ۱۶/ فیصد سے ۲۵/ فیصد ہوگئی۔ یہ اعداد وشمار ہندوستان کے نامور مؤرخ ہرنس لکھپا نے پیش کیے ہیں۔

اسلام کی اشاعت کے بہت سے اسباب ہوتے ہیں، اگر مسلمان اللہ کے حکم کے پیش نظر اور آخری پیغمبر حضرت محمد ﷺ کی سنت ودعوت پر عمل کرتے رہے، اگر اس دعوت وتبلیغ کے کام کو انجام دیں گے تو عجب نہیں کہ کوئی انقلاب آجائے اور مستقبل کا مؤرخ یہ لکھے کہ اسلام اس دور میں سب سے زیادہ پھیلا، جب اس کے پھیلنے کے ظاہری امکانات بہت کم تھے۔ جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے کہ انسانوں اور جنوں کی وجہ تخلیق اللہ کی عبادت بتائی گئی ہے۔ دین کی دعوت کا مطلب ہے اس کائنات کی وجہ تخلیق کی معاونت۔ اس کام پر اللہ کی مدد نازل ہوگی اور ہر طرف اسلام کا بول بالا ہوگا۔

❁❁❁

........بقیہ صفحہ ۱۳/ کا

کے راز کھلنا شروع ہوئے اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیاں اس پر ظاہر ہونے لگیں، پھر اس نے انسان اور اس کی زندگی کا مقصد سمجھا اور اس کے نتیجہ میں وہ اللہ کی زمین کا وارث بنا۔

"ولقد كتبنا في الزبور من بعد الذكر أن الأرض يرثها عبادي الصالحون"۔ (بیشک ہم نے تورات کے بعد زبور میں لکھ دیا کہ زمین کے وارث میرے نیک بندے بنیں گے)۔

انسان نے جب انسانی زندگی کے صحیح مقصد کو پیش نظر رکھا اور نبی کریم ﷺ کے دیے ہوئے سبق اور آپ کے بتائے ہوئے راستے کو اس نے یاد رکھا تو کائنات کی زمام کار اس کے ہاتھ میں رہی اور اس کی ذات سے مخلوق کو ہر طرح کا فائدہ پہنچتا رہا، لیکن جب اس نے اس سبق کو بھلا دیا اور مقصد سے غافل ہو کر صرف عقل وہوس کی راہ پر گامزن ہونے کی کوشش کی تو دنیا میں طرح طرح کی خرابیاں اور فساد رونما ہوئے اور انسانیت کا شیرازہ منتشر ہوگیا۔

موجودہ زمانہ جو تاریخ کا سب سے روشن دور کہا جاتا ہے اور جس میں انسان نے عقلی اعتبار سے ترقی کی بڑی بڑی منزلوں کو طے کیا ہے، اگر ہم غور کریں تو بعثت نبویؐ کے ماقبل زمانہ سے بہت ملتا جلتا ہے، اس زمانے میں بھی عقل وہوس کی حکمرانی تھی اور آج بھی اسی کی حکمرانی ہے اور کس قدر صحیح ہے یہ مقولہ کہ" انسان نے پرندوں کی طرح ہواؤں میں اڑنا اور مچھلیوں کی طرح سمندر کی تہوں میں پیرنا سیکھ لیا، لیکن اس کو انسان کی طرح زمین پر چلنا نہیں آیا"۔

اور اس کی صرف ایک ہی وجہ ہے کہ ہم نے اپنی ان تمام ترقیاں اور ایجادات میں زندگی کے صحیح مقصد کو پیش نظر نہیں رکھا اور نہ ہم نے اس راہ میں اس کی ضرورت ہی محسوس کی، اس لیے ہر طرف کی بے روح اور ہر بلندی بے مقصد ہو کر رہ گئی اور اس میں افادیت کا پہلو بہت کم اور ضرر وتباہی کا پہلو بہت بڑھ گیا۔

آج کی اس ترقی یافتہ دنیا کو بھی نبوت کے اس پیغام کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی چھٹی صدی عیسوی کی دنیا کو تھی اور آج کے ترقی پذیر انسان کی رہنمائی بھی اسی پیغام کے اندر مضمر ہے جو انسانیت اور حق کی عظمت کا پیام ہے، جس کو محمد رسول اللہ ﷺ رحمۃ للعالمین بن کر لائے تھے، یہی انسانی زندگی کا وہ لازوال پیام ہے جو رہتی دنیا تک کے لیے مشعل ہدایت ہے اور دنیا خواہ ترقی کی کتنی ہی اونچی منزل پر پہنچ جائے، لیکن وہ نبوت کے اس پیغام سے کبھی مستغنی نہیں ہوسکتی۔

وہ دانائے سبل، ختم الرسل، مولائے کل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادی سینا

❁❁❁

تذکیر وارشاد

دنیا تمہارے لیے اور تم آخرت کے لیے

ڈاکٹر سراج الدین ندوی (صدر کاروان ادب، بجنور)

دنیا میں انسانی زندگی کے متعلق مختلف نظریات موجود ہیں، کسی کے نزدیک یہ دنیا خود سے وجود میں آگئی اور خود سے ہی فنا ہو جائے گی، کوئی کہتا ہے کہ انسان بھی دوسرے جانوروں کی طرح ایک جانور ہے اور اسے فطرت کے مطابق برہنہ رہنا چاہئے اور گھاس پھوس کھانا چاہئے، کوئی کہتا ہے کہ انسان مر کر فنا ہو جاتا ہے اور کبھی دوبارہ پیدا نہیں ہوگا اس کے برعکس کسی کا نظریہ ہے کہ انسان مرنے کے بعد اپنے کرموں کے مطابق دنیا میں واپس آئے گا، کسی کے نزدیک انسان ایک شتر بے مہار ہے اور کوئی ''بابر بعیش کوش کہ دنیا دوبارہ نیست'' کا قائل ہے، کسی نے کہا کہ انسان کے گناہوں کا کفارہ خدا کے بیٹے یسوع نے اپنی جان دے کر ادا کر دیا ہے اس لیے انسان سے کسی قسم کا حساب نہیں ہوگا، کسی نے خود کو خدا کا محبوب گردان کر اپنے لیے تمام خدائی اختیارات حاصل کر لیے ہیں۔

ان تمام نظریات کے ساتھ ہی اسلام کا بھی ایک نظریہ ہے۔دین اسلام کے مطابق دنیا کا وقوع حادثاتی نہیں بلکہ منصوبہ بندی کے ساتھ ہوا ہے، اس کا ایک بنانے والا ہے، وہی اس کا مدبرو منتظم ہے اور اسی کی حکمرانی کائنات پر قائم ہے، اسی نے اپنے منصوبہ کے تحت انسان کی تخلیق فرمائی، بقائے حیات اور نوع انسانی کی نشوونما کے لیے تمام ضروری اشیاء کا نظم کیا، اسی کے ساتھ اس نے یہ بھی بتایا کہ زندگی کیسے گزارنا ہے؟

پتہ نہیں لوگ کن اسباب کی بنا پر کہہ دیتے ہیں کہ سب کچھ اپنے آپ ہو گیا اور بندر نے ترقی کر کے انسان کی شکل اختیار کر لی؟! رات دن کی گردش اور موسموں کے باقاعدگی سے بدلنے میں انھیں کوئی منصوبہ بندی کیوں نہیں نظر آتی ؟ آج بھی لاکھوں اور کروڑوں بندر ہیں، ان میں سے کوئی انسان کیوں نہیں بن جاتا؟ فطرت سے ہم آہنگی کا مطلب یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ہم برہنہ رہیں گھاس پھوس کھائیں؟

دنیا میں جو مشینیں بنائی جاتی ہیں، ان کے ساتھ ایک ''گائڈ بک'' بھی شائع کی جاتی ہے، ضرورت پڑنے پر ان مشینوں کے چلانے کی ٹریننگ بھی دی جاتی ہے، پھر انسان جیسی محیر العقل تخلیق کے ساتھ اگر ایسا کیا گیا ہے تو حیرت کیوں ہے؟ اس بات کے تسلیم کرنے میں کیا امر مانع ہے کہ انسان کی رہنمائی کے لیے اس کے خالق نے ایک گائڈ بک اور مربی عطا کیا ہے؟ دنیا کی ہر شئی میں مقصد تلاش کرنے والے خود اپنے مقصد وجود پر غور کیوں نہیں کرتے؟

انسان دراصل جواب دہی سے گھبراتا ہے، اس لیے اپنے حقوق و فرائض متعین کرنے سے بچتا ہے۔وہ چاہتا ہے کہ اللہ کی عطا کردہ جملہ نعمتوں سے جس طرح چاہے لطف اٹھائے، اپنی خواہشات کی پیروی میں اپنے جیسے انسانوں کا گلا کاٹے، انھیں اپنا غلام بنائے، انسان نے اپنی عیارانہ ذہنیت سے کام لے کر خدا کی آڑ میں بھی بہت سے سامان عیش حاصل کر لیے۔خود کو اللہ کا چہیتا کہہ کر اور برہما کے منہ سے پیدا ہونے کا فریب دے کر باقی لوگوں سے اپنی خدمت کرائی، ان سے نذریں اور نیازیں حاصل کیں، ایک کمہار اپنے بنائے ہوئے برتنوں میں کوئی بھید بھاؤ نہیں کرتا، ایک ماں اپنی کمزور، فاتر العقل، بدشکل اور اپاہج اولاد سے نفرت نہیں کرتی، پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ خالق ارض و سما اپنی مخلوق میں صرف رنگ و نسل یا مقام پیدائش کے بنا پر کوئی بھید بھاؤ کرے؟!

ہاں اگر کوئی تفریق ممکن ہے تو محبت اور بغاوت میں ہوسکتی ہے، ہر ادارہ اپنے فرماں بردار کارکنوں کی قدر کرتا ہے اور اپنے نکمے و نافرمان افراد سے کنارہ کشی اختیار کرتا ہے، دنیا کی تمام حکومتیں اپنے وفاداروں کو اعزاز سے نوازتی ہیں اور غداروں کو سولی پر چڑھا دیتی ہیں۔آخر اس اصول پر جب خالق کائنات عمل کرتا ہے تو انسان کی پیشانی پر شکن کیوں پڑ جاتی ہے؟!

دین اسلام کے مطابق ہر انسان اللہ کا بندہ اور غلام ہے، اس پر اللہ کی اطاعت لازم ہے، اللہ نے اپنی کتاب ہدایت اور اپنے ہادی کے ذریعے جو قانون اور ہدایت نامہ اسے دیا ہے اس کے مطابق زندگی گزارنا فرض ہے، اللہ کی عطا کردہ نعمتوں سے اسے لطف اندوز ہونے کا پورا موقع ہے مگر انھیں حدود کے اندر جو ان نعمتوں کے خالق

نے متعین فرمائی ہیں، انسان دنیا میں ایک خاص مقصد کے لیے بھیجا گیا ہے، وہ مقصد یہ ہے:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ

(میں نے جنوں اور انسانوں کو اپنی فرماں برداری کے لیے پیدا کیا ہے)۔

کائنات میں ہر شئی اپنے خالق کی فرماں بردار ہے، فطرت سے ہم آہنگی کا صحیح مفہوم یہی ہے کہ انسان بھی اپنے خالق کے بنائے ہوئے قوانین پر عمل کرے، چاند، سورج، زمین و آسمان سرمو اپنے مدار کی خلاف ورزی نہیں کرتے، یہاں تک جانور بھی جن سے بعض لوگوں نے برہنہ رہنا سیکھا ہے وہ بھی وہی چیزیں کھاتے ہیں جو ان کے لیے حلال ہیں، کسی بھینس، گائے یا بکری کو آپ گوشت کھاتے ہوئے نہیں دیکھتے، اسی طرح کسی شیر اور چیتے کو گھاس نہیں کھلائی جاتی۔ چڑیا گھروں تک میں ان کے لیے گوشت فراہم کیا جاتا ہے، کائنات کی کوئی شئ عیش وعشرت میں اس طرح مگن نہیں ہے جیسا کہ بعض انسانی گروہ عیاشی میں مست ہیں۔

دین اسلام کے مطابق ہر نعمت کے بارے میں اللہ تعالیٰ سوال کرے گا۔ سورہ تکاثر میں فرمایا گیا:۔ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ (پھر ضرور اُس روز تم سے اِن نعمتوں کے بارے میں سوال کیا جائے گا)

اسی بات کی وضاحت نبی اکرم ﷺ نے ان الفاظ میں فرمائی ہے۔:''قیامت کے دن کسی شخص کے قدم اس وقت تک اپنی جگہ سے نہ ہٹیں گے جب تک کہ اس سے پوچھ نہ لیا جائے؛ اس کی عمر کے بارے میں کہ اس نے اسے کن چیزوں میں بسر کیا؟ اس کے علم کے بارے میں کہ اس نے اسے کن چیزوں میں صرف کیا؟ اس کے مال کے بارے میں کہ اس نے اسے کہاں سے کمایا اور کہاں استعمال کیا؟ اور اس کے جسم کے بارے میں کہ اسے کن چیزوں میں کھپایا؟''۔(ترمذی)

اس حدیث کے مطابق حشر کے دن جو سوالات ایک انسان سے کیے جائیں گے وہ ان تمام نعمتوں پر محیط ہیں جو اس کو عطا کی گئی ہیں، ایک انسان کو عمر کی شکل میں زندگی کے مختلف مراحل، بچپن، جوانی اور بڑھاپا عطا کیے گئے ہیں، مال کی شکل میں روپیہ پیسہ اور اس کے ذریعہ حاصل کی جانے والی تمام اشیاء اس میں شامل ہیں، اسی طرح علم کی شکل میں اس کی جملہ صلاحیتیں جو اسے ودیعت کی گئی ہیں مراد ہیں، جسم کی شکل میں سماعت و بصارت اور عقل وفہم کی نعمتوں سے سرفراز کیا گیا ہے، زندگی، مال، علم اور جسم یہی چار چیزیں تو ہیں جن کے لیے انسان تگ و دو کرتا ہے اور یہی چار چیزیں اس کے لیے اشیائے صرف کی حیثیت رکھتی ہیں۔

جو لوگ خدا کو نہیں مانتے، یا جنھوں نے خدا کے دین میں تحریف کرکے اپنے لیے شفاعت و بخشش کے دروازے تلاش کرلیے ہیں ان کو تو چھوڑیئے لیکن جن لوگوں کو اللہ نے ایمان جیسی عظیم دولت سے نوازا ہے، جو بحالت ہوش اپنے اسلام لانے کے مدعی ہیں، جو حضرت محمد ﷺ سے اپنی محبت کا دم بھرتے ہیں اور قرآن کو سر ماتھے سے لگاتے ہیں، جب ان کو دنیا کے عشرت کدوں میں مست دیکھا جاتا ہے، جب ان کے اعمال آخرت فراموشی کی گواہی دیتے ہیں تب دل کو بہت تکلیف ہوتی ہے۔ ایک مومن کو معلوم ہے کہ دنیا اس کے لیے قید خانہ ہے اور کافر کے لیے جنت ہے؛''الدنیا سجن المومن و جنة الکافر''(مسلم) اسے بتادیا گیا ہے کہ دنیا بھلے ہی تمہارے لیے پیدا کی گئی ہو لیکن تم آخرت کے لیے پیدا کیے گئے ہو؛''الدنیا خلقت لکم وانکم خلقتم للآخرة''(بیہقی)

اسے مختلف پیرایوں میں یہ بات ذہن نشین کرائی گئی ہے کہ جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ باقی رہنے والا ہے اس کے پاس جو کچھ ہے وہ فنا ہوجائے گا:(مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ)

اسے جنت کی حسین وادیوں کی سیر اسی لیے کرائی گئی ہے کہ وہ رب کی رضا کی خاطر دنیا میں عیش وعشرت اور خدا فراموشی کی زندگی نہ گزارے۔

ایک مومن اللہ کا سپاہی ہے، وہ ہمیشہ اسلام کی حدود کی نگرانی کرتا ہے، جس طرح ایک سپاہی محاذ جنگ پر رہ کر لاپرواہی اور بدمستیاں نہیں کرسکتا اسے ضروریات زندگی بھی محدود مقدار میں فراہم کی جاتی ہیں، اسی طرح ایک مسلمان بھی کبھی اللہ سے غافل ہوکر زندگی نہیں گزار سکتا۔

تعجب ہے کہ ہماری آنکھوں کے سامنے اللہ و رسول کا قانون پامال کیا جارہا ہے، ہماری بہو بیٹیاں حیا اور حجاب کا مذاق اڑا رہی ہیں، ہمارے نوجوان سوشل میڈیا کی دنیا میں مست ہیں، عبادت گاہیں خالی ہیں اور میکدوں پر قطار لگی ہے، اس کے باوجود ہماری جبینوں پر شکن تک نہیں آتی، ہماری غیرت بیدار نہیں ہوتی، ہماری آنکھیں نم نہیں ہوتیں، کون جانتا ہے کہ کب کس کا وقت موعود آجائے اور پھر وہ حسرت سے کہے:

رَبِّ لَوْلَآ أَخَّرْتَنِيٓ إِلَىٰٓ أَجَلٖ قَرِيبٖ فَأَصَّدَّقَ وَأَكُن مِّنَ ٱلصَّٰلِحِينَ۔

(اے میرے رب، کیوں نہ تو نے مجھے تھوڑی سی مہلت اور دے دی کہ میں صدقہ دیتا اور صالح لوگوں میں شامل ہوجاتا)۔

محاسن اسلام

عدت کی حکمت اور جدید سائنس کا اعتراف

مولانا انیس الرحمٰن ندوی (جنرل سکریٹری، فرقانیہ اکیڈمی۔ بنگلور)

عدت کے تعلق سے آج کل ایک سوال یہ کیا جاتا ہے کہ طلاق یا شوہر کے انتقال کے بعد عورتیں عدت کے لئے آج سائنٹفک طریقہ کیوں نہیں اپنا سکتی ہیں؟ یعنی ایسی عورتوں کا pregnancy test کروایا جانا چاہئے اگر عورت حاملہ ہو تو وہ عدت پوری کریں اور اگر ٹیسٹ منفی آئے تو پھر ان پر عدت ساقط مانی جانی چاہئے۔ چونکہ اسلام دین فطرت ہے اس لئے ایسا حکم اسلام کے دین فطرت ہونے کی نمائندگی بھی کرے گا۔

بلاشبہ اسلام دین فطرت ہے۔ دراصل اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے جو زندگی کے ہر ہر پہلو کی راہنمائی کرتا ہے۔ ازدواجی زندگی اور اس سے متعلقہ مسائل میں بھی اسلام نے نہایت حکمت وبصیرت سے احکام دئے ہیں۔ انہی احکام میں ایک اہم حکم عدت waiting period کا ہے، جو نہ صرف عورت کی عزت ووقار کی حفاظت کرتا ہے بلکہ معاشرتی نظم وضبط کو بھی قائم رکھتا ہے۔ اس سلسلے میں جدید سائنسی تحقیقات نے عدت کی حکمت ومصلحت اور اس کی گہرائی اور گیرائی کو اجاگر کرتے ہوئے اس کی معنویت ومصداقیت کی ایک نئے جہت فراہم کردی ہے، جس سے شریعت اسلامی کے اعجازی پہلو ظاہر ہوتے ہیں، جو یہ ظاہر کرتے ہیں کہ عدت صرف انتظار نہیں ہے بلکہ وہ ایک گہرا فطری، سائنسی اور روحانی عمل ہے۔

اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ عدت کا مقصد صرف یہ دیکھنا ہے کہ عورت حاملہ ہے یا نہیں۔ لیکن درحقیقت، عدت کا تصور صرف حمل کے امکان تک محدود نہیں ہے بلکہ یہ ایک مکمل، سائنسی، طبی اور روحانی حکمت پر مبنی مدت ہے، جس کا تعلق عورت کے جسم، ذہن اور جذبات کے توازن سے بھی ہے۔

جدید میڈیکل سائنس نے ثابت کیا ہے کہ مرد اور عورت کے درمیان جنسی رابطہ کے بعد مرد کے نطفے sperm کے اجزاء صرف چند دنوں تک نہیں، بلکہ کئی مہینوں تک عورت کے جسم میں موجود رہ سکتے ہیں۔ یہ اجزاء نہ صرف عورت کے رحم میں بلکہ اس کے خون، ہڈیوں، حتیٰ کہ دماغ میں بھی trace کئے جا سکتے ہیں۔ اس کیفیت کو سائنسی اصطلاح میں microchimerism کہا جاتا ہے، یعنی ایک مرد کے خلیے عورت کے جسم میں مہینوں تک موجود رہتے ہیں اور اس کے جسمانی نظام پر اثر ڈالتے ہیں۔

عدت کے سلسلے میں دو سائنسدانوں کی تحقیقات کافی اہم ہیں۔ ایک ڈاکٹر جمال الدین ابراہیم اور دوسرے ڈاکٹر رابرپ گلہیم۔ ڈاکٹر جمال الدین ابراہیم مصری ہیں اور Toxicology and Biological Chemistry کے ماہر ہیں۔ انہوں نے ڈی این اے اور خلیاتی یادداشت Cellular Memory پر تحقیق کرتے ہوئے یہ معلوم کیا کہ "عورت کے رحم میں مرد کے ڈی این اے اور حیاتیاتی اثرات لمبے عرصے تک محفوظ رہتے ہیں۔ اگر ایک عورت بغیر عدت مکمل کئے دوبارہ شادی کرے، تو سابق شوہر کے DNA کے اثرات نئے شوہر کے DNA کے ساتھ کیمیکل طور پر متصادم ہو سکتے ہیں۔ یہ تنازعہ عورت کی اولاد، رحم کی صحت، اور جذباتی کیفیت پر منفی اثر ڈال سکتا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ تقریباً ۳ ماہ کا عرصہ یا تین حیض کا گزرنا عورت کے جسم کو مکمل طور پر صاف detox کرنے کے لئے ضروری ہے۔

دوسرے سائنسدان ڈاکٹر رابرٹ گلہیم ہیں جو ایک فرانسیسی سائنسدان ہیں، جنہوں نے نکاح کے بعد عورت کے جسم میں مرد کے اثرات پر تحقیق کی۔ اُن کی تحقیق سے درج ذیل باتیں سامنے آئیں:

☆ ہر مرد کا ایک منفرد بیولوجیکل کوڈ ہوتا ہے، جو جماع کے دوران عورت کے جسم میں منتقل ہوتا ہے۔

☆ عورت کے جسم میں یادداشت کے خلیے memory cells سابقہ مرد کے کوڈ کو محفوظ رکھتے ہیں۔

☆ اگر عورت فوراً نیا تعلق قائم کرے، تو کوئی حیاتیاتی پیچیدگیاں پیدا ہو سکتی ہیں، جن میں بچے کی صحت پر اثر، جینیاتی پیچیدگیاں اور جذباتی عدم توازن شامل ہیں۔

یہاں پر ایک اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ ڈاکٹر رابرٹ گلہیم ایک یہودی تھے اور جب انہیں اسلام میں مطلقہ اور بیوہ کی عدت کی مشروعیت کے متعلق معلوم ہوا تو انہوں نے اسلام کے ایک برحق دین ہونے کا اقرار کرتے ہوئے اسلام قبول کرلیا۔

بہر حال، امریکہ کے ادارہ صحت NIH سمیت کئی تحقیقی ادارے بھی اس بات کی تصدیق کر چکے ہیں کہ مرد کا جینیاتی مواد عورت کے جسم میں تین سے چار ماہ تک رہ سکتا ہے۔ یہ خلیے عورت کے ہارمون، مدافعتی نظام اور جسمانی توازن کو

متاثر کرتے ہیں۔ان سائنسی دریافتوں نے قرآن کے اس حکم کی حیران کن تصدیق کی ہے کہ عورت کو طلاق یا بیوگی کے بعد عدت گزارنی چاہئے، جو:

☆ طلاق کی صورت میں: تین حیض یعنی تقریباً تین ماہ ہے۔

☆ شوہر کی وفات کی صورت میں: چار ماہ اور دس دن ہے۔

یہ مدت عورت کے جسم کو سابقہ تعلق کے اثرات سے پاک کرنے اور ایک نئے مرحلے کے لئے مکمل طور پر تیار کرنے کے لئے قدرتی طور پر موزوں ہے۔ اس دوران رحم صاف ہوجاتا ہے، ہارمون توازن میں آ جاتے ہیں، اور مدافعتی نظام نئے ممکنہ تعلق کو قبول کرنے کے لئے خود کو تیار کرتا ہے۔ یہ ایک مکمل حیاتیاتی ری سیٹ reset کی مانند ہوتا ہے۔

لہٰذا عدت نہ صرف جسمانی صفائی کا عمل ہے بلکہ یہ عورت کے لئے ایک روحانی و ذہنی سکون کا وقت بھی ہے۔ وہ اس دوران اپنے جذبات، غم اور آنے والی زندگی کے لئے خود کو سنبھال سکتی ہے۔ اس لئے یہ کہنا کہ عدت صرف حمل جانچنے کے لئے ہے یا آج کل چونکہ pregnancy test موجود ہے اس لئے عدت کی ضرورت نہیں، ایک سطحی اور لاعلمیت پر مبنی بات ہے۔

عدت کو نظر انداز کرنے کے خطرات

اب یہاں ایک اہم سوال یہ ہے کہ کیا عدت کے دوران نکاح یا جنسی تعلق طبی اعتبار سے نقصان دہ ہوسکتا ہے؟ اور کیا microchimerism کے باعث عدت کی خلاف ورزی سے عورت کو کسی قسم کے نقصانات کا سامنا کرنا پڑسکتا ہے؟ اس سلسلے میں جدید سائنسی تحقیقات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسی صورت میں عورت کو اس کے بڑے سنگین طبی وصحی خطرات لاحق ہوں گے جن کی مختصر تفصیل حسب ذیل ہے:

۱-مدافعتی نظام کی الجھن

عدت میں عورت کے جسم میں پچھلے شوہر یا مرد کے خلیاتی باقیات cellular remnants موجود ہوتے ہیں، اور عورت کا جسم پچھلے مرد ساتھی کے خلیات یا جینیاتی ذرات کو ابھی تک پراسیس کر رہا ہوسکتا ہے۔ اس دوران اگر عورت دوسری مباشرت میں جائے اور نیا ڈی این اے اس کے جسم میں داخل ہو تو دو مختلف مردوں کے جینیاتی مواد کا عورت کے جسم میں overlap ہوسکتا ہے اور اس سے مدافعتی نظام میں پیچیدگیاں یا بے ترتیبی پیدا ہوسکتی ہے۔ جس سے اس کے صحت کو سنگین قسم کے خطرات لاحق ہوتے ہیں۔

۲-سوزش اور تولیدی صحت کے مسائل

نئی تحقیقات یہ اشارہ دیتی ہے کہ تولیدی بافتوں reproductive tissues میں ایک سے زائد مردوں کا جینیاتی مواد موجود ہونے سے بعض تولیدی مسائل کا خطرہ بڑھ سکتا ہے، جیسے کہ: اسقاط حمل، بانجھ پن، خود مدافعتی autoimmune ردعمل وغیرہ۔

۳-حمل میں جینیاتی الجھن

بعض صورتوں میں، مائیکروچیمر یزم microchimerism غیر متوقع جینیاتی امتزاج کا باعث بن سکتا ہے۔

۴-ہارمونی اور جذباتی اثرات

ہر جنسی تعلق عورت کے ہارمونی اور جذباتی نظام کو متاثر کرسکتا ہے۔ تیزی سے ایک تعلق سے دوسرے تعلق میں جانا ذہنی صحت، جذباتی وابستگی کی صلاحیت، اور ہارمونی توازن کو متاثر کرسکتا ہے، اور عورت کا tissue repair mechanisms متاثر اور خراب ہوسکتے ہیں۔

۵-کینسر کے خطرات

اس سلسلے میں چونکانے والی متعدد سائنسی تحقیقات سامنے آچکی ہیں کہ عدت کے وقفے میں ایک سے زائد مرد کا DNA داخل ہونے سے اس عورت کو کئی قسم کے کینسر کے خطرات لاحق ہونے کا سبب بن سکتا ہے۔ جن میں عنق رحم کا سرطان (سروائیکل کینسر) اور چھاتی کا سرطان (بریسٹ کینسر) قابل ذکر ہیں۔ لہٰذا عمومی طور پر دیکھا گیا ہے کہ یہ کینسر ان خواتین کو لاحق ہوتا ہے جو ایک سے زیادہ مردوں کے ساتھ جنسی تعلقات رکھتی ہیں۔

آج عالمی پیمانے پر مختلف قسم کے کینسروں میں زیادتی کی ایک اہم وجہ آزادانہ جنسی تعلقات کو قرار دیا جارہا ہے، جس میں ایک عورت بیک وقت ایک سے زائد مردوں سے جنسی تعلقات استوار کرتی ہے۔ لہٰذا ایسی صورتوں میں کینسر پہلے عورتوں کے جسم میں پیدا ہوتا ہے اور پھر اس سے جنسی طور پر رابطہ میں آنے والے افراد کو منتقل ہوکر دوسروں تک پھیلنے کا سبب بنتا ہے۔

بہرحال، اسلام نے چودہ سو سال پہلے عدت کا وہ پاکیزہ نظام دیا جسے آج سائنس بھی تسلیم کررہی ہے۔ شریعت کے احکامات نہ صرف روحانی اور اخلاقی لحاظ سے بلند ہیں، بلکہ طبی اور سائنسی لحاظ سے بھی فطرت کے عین مطابق ہیں۔ لہٰذا عدت عورت کے جسم، ذہن اور روح کو سابقہ تعلق کے اثرات سے پاک purification کرنے اور ایک نئی شروعات کے لئے تیار کرنے کا ایک قدرتی اور حکیمانہ عمل ہے۔ یہ شریعت کا وہ نظام ہے جس میں انسان کی فطرت، صحت اور عزت کا مکمل خیال رکھا گیا ہے۔

فکرونظر

انسانی زندگی میں اے آئی کا دخل اور اس کے اثرات

مولانا مطیع الرحمٰن عوف ندوی (ناظر معہد سکروری، ندوۃ العلماء)

انسانی زندگی جن بنیادی عناصر پر مبنی ہے ان کو جلا بخشنے اور ان کی ترویج کے لئے اللہ تعالیٰ نے اسباب کا نظم فرمایا ہے، ان عناصر میں روح، عقیدہ اور اخلاق مرکزی کردار کے حامل ہیں، اخلاق و عقیدہ کا مرکز قلب ہے اور جسم عبادت و ریاضت اور معیشت کا ایک بنیادی عامل اور ذریعہ ہے، اللہ تعالیٰ نے انسان کو عزت دی اور اشرف المخلوقات بنایا "**ولقد کرمنا بنی آدم**" (الاسراء: 70) اور اس کو خلیفۃ اللہ فی الارض بنایا "**إني جاعل في الأرض خليفة**" (البقرہ: 30) اور پھر اس نے انسان کی ہدایت کے لئے نبیوں اور رسولوں کو بھیجا: **لقد أرسل الله رسوله من بينكم يتلوا عليكم آياته ويزكيكم ويعلمكم الكتاب والحكمة ويعلمكم مالم تكونوا تعلمون** (آل عمران: 164) اور اس کو فطری قوت عطا کی، جو اسے کائنات پر غور وفکر کرنے پر آمادہ کرتی ہے، **إن في خلق السماوات والأرض واختلاف الليل والنهار، لآيات لاولي الالباب** (آل عمران: 190)

دنیا وجود میں آنے کے بعد ترقی کے منازل طے کرتی گئی، کبھی انسان مسافت سفر کو طے کرنے کے لئے پاپیادہ چلتا تھا، اونٹ، خچر اور گھوڑے کو استعمال کرتا تھا، لیکن رفتہ رفتہ ترقی کی منزلیں طے کرکے ہوائی جہاز تک پہنچ گیا، پیغام رسانی اور گفتگو کے لئے مخاطب کی موجودگی لازم ہوتی تھی پھر سلکی نظام کے تحت دور دراز سے گفتگو ہونے لگی، آج سے پچاس سال قبل شاید کسی نے تصور بھی نہ کیا ہوگا کہ آنے والے زمانہ میں لاسلکی نظام رائج ہوگا اور ایک انسان دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک بات کر سکے گا، صرف یہی نہیں بلکہ روبرو ہوکر، ترقی ہوتی گئی اور ایک مختصر سے عرصہ میں دنیا کا نقشہ ہی بدل گیا، خودکار آلات ایجاد ہونے لگے اور انسانوں کی جگہ روبوٹ نے لے لی، ڈیجیٹل سسٹم نافذ ہوگیا اور جہاں انسان کو افسران اور افراد کا سامنا کرنا ہوتا تھا اب محض اسکیننگ سسٹم اور فنگر پرنٹ کافی ہوگیا، ترقی یافتہ ممالک میں کرنسی نوٹ اور کاغذ کی جگہ ڈیجیٹل کرنسی اور نوٹ پیڈ نے لے لی، ترقی اتنی بلندیوں تک پہنچ گئی کہ انسان کے تصور سے بالاتر اور وہم وگمان سے پرے ہو۔

اب اے آئی AI کا دور شروع ہوا ہے، جس نے انسانی دُنیا میں قیامت برپا کردی ہے اور اس جہاں گیتی میں انقلاب پیدا کردیا ہے، AI اے آئی ایک مصنوعی ذہانت ہے جس نے زندگی کے مختلف شعبوں کا احاطہ کررکھا ہے، اس نے سیاست، معاشیات، سائنس و ٹیکنولوجی اخلاقیات و ساجیات، مذہب اور عقیدہ وافکار الغرض زندگی کے ہر شعبہ میں قدم رکھ دیا ہے، یہ الگ موضوع ہے کہ اس کی افادیت فزوں ہے یا مضرت۔ یہ ایک مستقل موضوع ہے، اور یہ بھی اللہ تعالیٰ کی اشرف مخلوق کی ذہانت کی ایجاد ہے، جو عقل وذہانت اسے اللہ تعالیٰ نے عطا کی ہے، یہ الگ بات ہے کہ اے آئی AI علم وذہانت کا پروردہ ایک نظام ہے جو بہرحال عشق اور دیوانگی سے عاری ہے ؎

علم نے مجھ سے کہا عشق ہے دیوانہ پن
عشق نے مجھ سے کہا علم ہے تخمین وظن

اس موضوع پر مجھے لکھنے کا خیال اس وقت آیا جب Open Brain اوپن برین کی تفصیلات سامنے آنا شروع ہوئیں، یہ کوئی ادارہ یا ٹیکنالوجی تو وجود میں نہیں ہے لیکن غالب گمان ہے کہ جلد ہی یہ وجود پذیر ہوجائے، یہ مستقبل کا ایک منظرنامہ ہے اور فی الحال ایک پروجیکٹ کی شکل میں ہے جسے AI 2027 کا نام دیا گیا ہے۔ اس کا امتیاز خودکار کوڈنگ ہے اور اس طرح رفتہ رفتہ انسان جس نے AI کو ایجاد کیا خود اے آئی اس کی جگہ لے لیتا ہے اور انسانی AI تخلیق سے بہتر AI کو جنم دیتا ہے، اور انسان محض ایک تماش بین کی طرح رہ جاتا ہے، اور اے آئی رفتہ رفتہ پوری دنیا پر حکمرانی کرنے لگتا ہے اور پھر وہ انسان کے وجود کو ختم کردیتا ہے، اور اس کی جگہ اے آئی لیتا ہے، لیکن یہ تخیلات تو ہوسکتے ہیں حقیقت نہیں، تاہم اتنا ضرور ممکن ہے کہ اے آئی کی طاقت مستقبل میں انسان کو بے شمار مسائل سے دوچار کردے اور انسان خود اپنی تخلیق کے سامنے کمزور و عاجز ہوجائے لیکن یہ ایک مستقل موضوع ہے جس پر ان شاء اللہ آئندہ تحریر کروں گا، اس وقت

'اے آئی AI اور انسانی زندگی پر مرتب ہونے والے اثرات' ہی مطمحِ نظر ہے۔

اس سے قبل ذکر ہو چکا ہے کہ آے آئی کے اثرات مختلف شعبہ ہائے زندگی پر مرتب ہو رہے ہیں، سیاست میں اس کے اثرات اس طور پر مرتب ہوں گے کہ جو کمپنی یا ملک اے آئی میں برتری حاصل کرے گا وہ دنیا میں معاش اور دفاعی لحاظ سے غلبہ حاصل کرے گا، امریکہ، چین، یورپ وغیرہ Ai Arms race میں ایک دوسرے کی ریس میں شامل ہوں گے، اسی طرح اے آئی کا کنٹرول اگر بڑھتا ہے تو سیاسی سطح پر بھی اس کے اثرات کے مرتب ہونے کا امکان ہے، جہاں تک معاشی واقتصادی میدان کا معاملہ ہے تو اے آئی AI کی وسعت کی رفتار سے انسانی روزگار کے مواقع متاثر ہوں گے، ملازمتیں ختم ہوں گی، اور انسان کی افادیت اور ضرورت مفقود ہوتی چلی جائے گی، جیسا کہ خود موجودہ وقت میں بہت سے خودکار سسٹم اور روبوٹ نے انسان کی ضرورت کو متاثر کیا ہے، اور ان کے روزگار پر ڈاکہ ڈالا ہے۔

اے آئی خود سائنس و ٹیکنولوجی میں اپنا اہم رول ادا کرے گا، وہ خود ریسرچ کرے گا، اور ماحولیات کو تبدیل کرنے، دوائیوں کی تیاری، علاج اور سرجری کے میدان میں بالادستی اور توانائی کے بحران کے خاتمہ میں اہم رول ادا کرے گا، اور خود سائنس دانوں کی طرح کام کرے گا، خلاء میں جانا، سٹیلائٹ کے نظام کو مربوط کرنا اور دشمن سے ملک کی حفاظت کرنا اس کے لئے آسان ہوگا، جیسا کہ ابھی ابتدائی مرحلہ میں ڈرون ٹیکنولوجی اور آئرن ڈوم اپنی صلاحیتوں سے دفاعی نظام پر اثرانداز ہو رہے ہیں، اے آئی کو اگر بہت سے شعبوں کا مجموعہ کہا جائے تو اس کا ایک شعبہ چیٹ جی پی ٹی ہے، اس چھوٹے سے شعبہ کی کارکردگی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہ مختلف علوم وفنون میں آپ کے اشکالات کو دور کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، مثلاً ایک عالم دو تین سال کے اختصاص کے بعد ایک مفتی کا درجہ حاصل کرتا ہے، لیکن ایک عام شہری بھی اس چیٹ سے مسائل کے بارے میں استفسار کر سکتا ہے، اور اختلافات اور دلائل کے ساتھ جواب حاصل کر سکتا ہے، خواہ وہ مسائل ارکان اسلام سے متعلق ہوں یا عقائد سے، حتیٰ کہ سراجی کے مسائل بھی چٹکی بجاتے حل کر دیتا ہے، جبکہ اپنی عمر عزیز کے دس بارہ سال لگانے والا ایک مفتی لازم نہیں ہے کہ ہر مسئلہ کو دلائل کے ساتھ کم وقت میں بیان کر سکے، اسی طرح حساب کے لئے انسانی دماغ کو پہاڑوں اور ریاضی کے اصولوں کا سہارا لینا ہوتا ہے لیکن نئی ایجادات میں کلکولیٹر، اور کمپیوٹر کے مختلف سافٹ ویئر ایکسل وغیرہ سیکنڈوں میں ریاضی کے مسائل حل کر دیتے ہیں اور حساب خواہ کتنا ہی پیچیدہ اور طویل ہو غلطی کا امکان نہیں ہوتا، لیکن انسان کے ذریعہ کئے جانے والے حساب میں بسا اوقات اغلاط کا امکان رہتا ہے۔

اے آئی کی صلاحیتوں میں ایک اہم فیکٹر انسان وحیوانات کی آواز کی نقل کا ہے، اس سے جہاں بعض شعبوں میں سہولت ہوئی ہے وہیں آواز کی کلوننگ کے بے شمار نقصانات بھی سامنے آرہے ہیں، ٹی وی چینل اور خبر رساں ایجنسیاں اب وائس کلوننگ ٹولس کے ذریعہ خبروں کو نشر کر رہی ہیں، اس سے ان کے اخراجات میں کمی آتی ہے اور کم عملہ سے کام نکل جاتا ہے، اس کے لئے سب سے مشہور Tool ہے Voice eleven Lab آپ صرف 30 سے 60 سکنڈ اپنی آواز ریکارڈ کریں یہ آپ کی آواز میں پورے متن کو پڑھ سکتا ہے، اس کے علاوہ جو ٹول ہیں ان کے صرف نام پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

2. Resemble A,

3. Descript(Overdube)

4. I Speech وغیرہ

مزے کی بات تو ہے کہ اب بندر کے ذریعہ Vlog تیار کئے جا رہے ہیں، اور جس طرح جذباتی تقریر کرنے والے یا مذہبی پروگرام منعقد کرنے والے مفکرین عوام کے لئے بیانات نشر کرتے ہیں اب انسانی آواز کو کلون کر کے بندر کی متحرک صورت کے ذریعہ یہ کام لیا جا رہا ہے، وہ ملکوں اور شہروں کا سفر کر کے اپنے تأثرات کو ولاگ میں پیش کرتا ہے، یہ اس ایجاد کا ایک منفی پہلو ہے جو مستقبل میں بہت سی اخلاقی برائیوں کو جنم دے گا۔

یہ آلات و وسائل نہ بذات خود مفید ہوتے ہیں اور نہ ہی مضر، ان کا بے جا استعمال ان کو مضرت سے بھر دیتا ہے تو مفید استعمال ان کی افادیت سے خلق کو مستفید کرتا ہے، اب جب کہ یہ آلات انسانی زندگی میں تیزی سے اثر انداز ہو رہے ہیں، ضرورت ہے کہ ان کے مفید استعمال کو رواج دیا جائے اور ان سے فائدہ اٹھایا جائے، اور ان کے ضرر سے خود اور ملت کو محفوظ رکھا جائے، مثلاً جو دینی، اصلاحی اور دعوتی مضامین اخبارات و رسائل میں شائع ہو رہے ہیں وہ ان کے قارئین تک پہنچتے ہیں، اگر اے آئی کے ذریعہ ان کی آڈیو کلوننگ ٹولز کے ذریعہ بنائی جائے جس میں وقت کی بھی بچت ہے اور توانائی کی بھی، تو اس طرح اپنے فکر وخیال کو عام کرنے میں سہولت

ہوگی اور پیغام کو زیادہ افراد تک پہنچایا جاسکے گا۔

سائنس وٹکنولوجی میں ہم بہت پیچھے ہیں، اے آئی کے توسط سے ہم اس میدان میں استحکام پیدا کرسکتے ہیں اور طبّ وسرجری کے میدان میں ہم دنیا میں ایک مقام حاصل کرسکیں گے، ممالک کے حکمراں اور اقوام اس ٹیکنولوجی کے ذریعہ دفاعی قوت میں اضافہ کرسکیں گے، اور اپنے بازو مضبوط کرنے کے علاوہ دشمن پر رعب جمانے میں بھی کامیاب ہوسکیں گے۔

سب سے اہم ضرورت طبقہ علماء سے متعلق ہے کہ مستقبل قریب میں ان کا مقابلہ ایک ایسے آلہ سے ہے جو کسی دینی ادارہ کا فارغ تو نہیں ہے لیکن اس کے پاس علوم وفنون کا خزانہ ہے، وہ فن تفسیر کی باریکیاں بھی بتاسکتا ہے اور حدیث وفقہ کے نکتہ سنجیاں بھی کرسکتا ہے، وہ جذباتی اور اموشنل تقریر بھی کرسکتا ہے، وہ فن خطابت کے جوہر بھی دکھا سکتا ہے، وہ تاریخ کی ورق گردانی جلد اور صفحات کے حوالہ سے کرسکتا ہے، اور ادب کے لطائف اور شعر وشاعری کے نمونے چٹکی بجاتے پیش کرسکتا ہے۔ اس لئے ارباب مدارس اور فارغین کرام کو ایسی مستحکم تیاری کی ضرورت ہوگی جو اسلام کی روح، اس کے اصول وفروع اور قرآن و سنت کے اسرار اور فقہ وقضا کے اصول ومسائل پر گہری دسترس رکھتا ہو، اس لئے کہ علوم کا یہ خزانہ طبقہ علماء کے لئے ایک چیلنج ثابت ہوسکتا ہے، اور عوام کو بحث ومناظرہ کا بآسانی مواد فراہم کرسکتا ہے، اس سے شکوک وشبہات اور اشکالات کا عموم ہوگا، اور مرجعیت علماء دین کو حاصل ہوگی لیکن اس کے لئے انہیں بھرپور تیاری کرنی ہوگی، اور وسعت مطالعہ اور فکر ونظر میں پختگی حاصل کرنی ہوگی۔

سیرت طیبہ کے سلسلۃ الذہب کا نیا شاہکار

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رحمۃ للعالمین

تالیف: حضرت مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی مدظلہ العالی

عہد حاضر میں محدثین ہند کی عظیم الشان روایات کے وارث وامین حضرت مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی دامت برکاتہم کی تصنیفی وتالیفی زندگی کی حاصل، سرور دوعالم ﷺ کی سیرت پاک سے روشنی اور رہنمائی کے لیے موجودہ عہد کے تقاضوں اور جدید انسانی معاشرہ ومزاج کی مناسبت سے حضور پاک ﷺ کی رحمۃ للعالمینی کی دلنشیں، دلنواز اور دلکش تشریح علامہ شبلی اور مولانا سید سلیمان ندوی کی سیرت النبی ﷺ کے سو سال بعد سیرت نگاری میں مجددانہ کارنامہ تین ضخیم جلدوں میں خیر وبرکت کی حامل یہ سیرت مصطفی عرب وعجم کے اہل نظر کی داد وتحسین کے مطابق:

۱ حضور ﷺ کی ذات اور سیرت پر لکھنے کا مطلب ہے کہ حرمین شریفین پر بھی قلم اٹھایا جائے، یہ وہ نکتہ ہے جسے ڈاکٹر تقی الدین ندوی نے اس کتاب میں خاص طور پر ملحوظ رکھا۔
محمد رسول اللہ ﷺ رحمۃ للعالمین (ڈاکٹر عبد اللہ بن عبد المحسن الترکی- سابق جنرل سکریٹری رابطہ عالم اسلامی، مکہ مکرمہ)

۲ یہ سیرت پاک کے موضوع پر گراں قدر تصنیف ہے، میں اس کو شیخ ندوی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی خصوصی مہربانی اور فضل ربانی سمجھتا ہوں۔ (ڈاکٹر سعود بن ابراہیم الشریم- امام وخطیب مسجد حرام مکۃ المکرمہ)

۳ یہ جامع انسائیکلوپیڈیا ہے، مشرق ومغرب میں پوری امت اسلامیہ کے لیے گراں قدر تحفہ ہے۔
(ڈاکٹر ابولبابہ طاہر صالح حسین)

۴ یہ عظیم الشان کتاب جامعیت اور دلکشی میں بے مثال اور عظیم شاہکار ہے اور ایسی کتاب ہے جس میں افراط و تفریط دونوں انتہاؤں سے بچ کر اعتدال کا راستہ اختیار کیا گیا ہے، زبان عصر حاضر کے فہم کے مطابق ہے۔
(ڈاکٹر موفق بن عبد اللہ- استاذ حدیث جامعہ ام القریٰ)

۵ بنیادی خوبی یہ ہے کہ سیرت نبوی پر لکھنے کے لیے جن باتوں کا علم ضروری ہے اس میں صاحب کتاب کمال مہارت کے حامل ہیں۔ اس کے مطالعہ سے ایمان وعقیدہ کو مضبوطی حاصل ہوتی ہے۔ (مولانا سید محمد رابع ندوی)

دیدہ زیب کتابت، بہتر مجلد خوبصورت سرورق کے ساتھ تین جلدوں کا مکمل سیٹ حاصل کرنے کے لیے جامعہ اسلامیہ مظفر پور اعظم گڑھ یوپی اور دیوبند اور ندوہ کے مشہور مکتبوں سے رابطہ کیا جاسکتا ہے۔

پتہ: جامعہ بُکڈپو جامعہ اسلامیہ مظفر پور اعظم گڑھ یوپی
موبائل نمبر: 9450876465 9532829745
قیمت: 2000 خصوصی رعایت کے ساتھ قیمت: 750

احتسابِ نفس

---احساسِ زیاں جاتا رہا

ڈاکٹر محمد وثیق ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء)

اسلامی مفکر مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ نے "البعث الاسلامی" (شمارہ نمبر:۱، جلد:۲۵، جولائی ۱۹۸۰ء) میں ایک مضمون بعنوان۔ "من صناعة الموت إلى صناعة القرارات" تحریر کیا تھا، پھر یہ مضمون ۱۹۸۰ء ہی میں ایک مستقل رسالے کی شکل میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں انہوں نے مسلم وعرب حکمرانوں کے ماضی اور حال کا تقابلی جائزہ لیا ہے اور امتِ مسلمہ کی وہ عظیم تاریخ یاد دلائی ہے جو اسلام کی سربلندی، جانفشانی، غیرت وحمیت اور دشمنوں کے مقابلہ میں شجاعت وقربانی سے لبریز ہے۔

مگر آج اقدار بدل گئی ہیں، معیار الٹ گئے ہیں اور توازن بگڑ گیا ہے، زبان وبیان کا شور مچ گیا، کانفرنسیں اور سیمینار کثرت سے ہونے لگے، فائیو اسٹار ہوٹلوں اور ایئر کنڈیشنڈ ہالوں میں نشستوں اور اجلاس کی بھرمار ہوگئی۔ نتیجہ یہ ہے کہ جرأت و شجاعت کے بجائے کھوکھلے دعوے اور پرشور بیانات رہ گئے ہیں، حقیقی اسلام سے وابستگی کے بجائے اب ساری وابستگیاں جماعتوں، تحریکوں، تنظیموں اور فقہی مسالک سے جڑ گئی ہیں، قلم اور کاغذ نے وہ جگہ لے لی جو کبھی دین کی سربلندی کے لیے دی گئی جان کی قربانی کی ہوا کرتی تھی۔

اسلامی تاریخ بتاتی ہے کہ ماضی کے حکم راں اور قائدین کسی بھی حرمت کی پامالی یا مسلمانوں پر ہونے والے ظلم پر شیر کی طرح للکارتے تھے، دشمنوں کو عبرت ناک شکست دیتے تھے، عباسی خلیفہ معتصم کا وہ کردار کون بھلا سکتا ہے جس نے ایک مظلوم مسلمان عورت کی پکار پر رومی بادشاہ کو "عموریہ" میں شکست دی، نورالدین زنگیؒ اور عظیم قائد صلاح الدین ایوبیؒ نے صلیبیوں کی کمر توڑ دی اور اسلامی ملکوں کو صلیبی یلغار سے محفوظ کیا، سلطان بیبرس نے تاتاریوں کو شکست فاش دی، عثمانیوں نے آخری عہد تک یورپ کو ناکوں چنے چبوادیے۔

لیکن آج منظر بالکل بدل چکا ہے، کوئی حادثہ یا سانحہ ہو، کوئی نیا بحران یا المیہ پیش آئے جس کے اصل شکار مسلمان ہوں، تو ہمارے حکم راں اور قائدین صرف اخباری بیانات، سوشل میڈیا کی مہمات، امداد کے پرکشش اعلانات، سیمینار وکانفرنسوں کے انعقاد اور قراردادوں و سفارشات پر اکتفا کرتے ہیں، اور یوں سمجھتے ہیں کہ انہوں نے امت کے حقوق ادا کردیے، نتیجہ یہ ہے کہ بیانات کا ڈھیر، قراردادوں کا انبار اور سفارشات کی بھرمار ہو چکی ہے، فلسطین اور غزہ کی مثال ہمارے سامنے ہے؛ قراردادوں اور اجلاسوں کی بھرمار ہے، لیکن دشمن بدستور بچوں، عورتوں اور بوڑھوں کو شہید کر رہا ہے، نسل کشی کر رہا ہے، بمباری اور بربادی کا بازار گرم کیے ہوئے ہے اور اہل غزہ بھوک وپیاس سے تڑپ رہے ہیں، اور تڑپ تڑپ کر مر رہے ہیں۔

اس کے مقابلے میں عملی اور خاموش جدوجہد، سنجیدہ منصوبہ بندی، منظم حکمت عملی، قربانی اور اخلاص اور ترجیحات کا تعین —— یہ سب آج امت میں عنقا ہیں، شاعر محمود سامی البارودی نے ایسی ہی مایوسی کے عالم میں کہا تھا جس کا مفہوم یہ ہے:

"میں نے ان سے خیر کی امید باندھی تھی؛ مگر حسرت نصیب ہوئی۔
ان کے وعدوں کا حال یہ ہے کہ صبح ہوئی تو عورتیں طلاق یافتہ ہو چکی تھیں۔
وہ اپنے گھروں میں شیروں کی طرح ہیں، مگر معرکۂ کارزار میں مرغی کی طرح کمزور۔
اگر جان دینے کا حوصلہ نہیں، تو حق کی حفاظت کیسے ہوگی؟"

اسی طرح عربی شاعر حافظ ابراہیم نے ماضی کی شان وشوکت پر حسرت جتائی:

"دنیاوی کروفر اور شان وشوکت میں ہمارے پاس کچھ باقی نہیں۔
اب صرف آنکھوں میں آنسو رہ گئے ہیں۔
ہم زمانے کے گلے کا ہار تھے، اب وہ موتی بکھر گئے۔
ہماری عزت کا چراغ بجھ گیا اور ہم بے سروسامان ہوگئے"۔

شاعر عمر ابو ریشہ نے موجودہ عرب دنیا کی حالت پر کہا ہے:

"کیا اسرائیل کے پرچم مقدس مقامات میں لہرائیں گے؟ اور تم ذلت پر خاموش رہو گے؟
امتِ عربیہ! تم نے کتنے بت تراشے، جو بتوں کی پاکیزگی سے بھی عاری تھے۔

.......بقیہ صفحہ ۳۵/ پر

نعمت ربانی

عقل-زندگی کا محور

ڈاکٹر عبید الرحمٰن ندوی (استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء)

سوامی پارتھاسارتھی اپنی کتاب "The Fall of the Human Intellect" میں نہایت خوبصورت انداز میں عقل اور فہم کے مابین فرق کو واضح کرتے ہوئے لکھا ہے: "انسان اپنے موضوع کا بنیادی علم رکھنے کے ساتھ ساتھ ایک تیز طبع سائنس داں ہوتا ہے، اس نے کافی فہم حاصل کرلیا ہے لیکن کبھی اپنی عقل کو ترقی دینے کے بارے میں نہیں سوچا ہے، اس کی عقل ہمیشہ کمزور رہی ہے، اس میں دماغ کے مختلف تقاضوں سے نمٹنے کی قوت کا فقدان ہوتا ہے۔ اس کی عقل اتنی طاقتور نہیں ہوتی کہ معیوب خواہشات کو قابو میں رکھ سکے"۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ آج پورا عالم عقل کے فقدان کی وجہ سے انتشار کی حالت میں ہے، اس جوہر میں اضافہ کیے بغیر سکون و مسرت کا حصول ممکن نہیں ہے، امام غزالیؒ نے فرمایا ہے: "عقل علم کا ذریعہ اور اس کا سرچشمہ ہوتی ہے نیز اس کی بنیاد ہوتی ہے۔ علم اس سے ایسے ہی پھوٹتا ہے جیسے درخت سے پھل، سورج سے روشنی اور آنکھ سے بصارت۔"

یہ بات ذہن نشین رہے کہ لفظ 'عقل' کا استعمال قرآن مجید میں عقلِ انسانی کے لیے ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں کہ ان کے دل سمجھنے والے اور ان کے کان سننے والے ہوتے؟ حقیقت یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں مگر وہ دل اندھے ہوجاتے ہیں جو سینوں میں ہیں"۔ (۲۲: ۴۶)

نبی اکرم محمد ﷺ نے فرمایا: "وہ پہلی شے جس کی تخلیق اللہ نے کی وہ عقل ہے۔ اس کی تخلیق فرما کر اللہ نے یہ حکم دیا: آگے آجاؤ، اور یہ آگے آگئی۔ پھر اسے نے حکم دیا: واپس ہوجاؤ، اور یہ واپس ہوگئی۔ پھر اللہ نے فرمایا: "میری عزت و جلال کی قسم! میرے نزدیک تجھ سے زیادہ محترم شے میں نے نہیں پیدا کی۔ تیرے ذریعے میں سلب کرتا ہوں اور تیرے ذریعے میں عطا کرتا ہوں، تیرے ذریعے میں انعام دیتا ہوں اور تیرے ہی ذریعے میں سزا دیتا ہوں"۔

نبی پاک ﷺ کا مزید فرمان ہے: "یقیناً وہ مومن جو اللہ کا زیادہ محبوب ہوتا ہے وہ ایسا ہوتا ہے جو راہِ خدا میں جد وجہد کرتا ہے اور اپنے لوگوں کو مشورہ دیتا ہے، جس کی سمجھ مکمل ہوتی ہے؛ جو خود نصیحت حاصل کرتا ہے اور آخر کار حق کو دیکھ لیتا ہے اور اس کے مطابق پوری زندگی عمل کرتا ہے۔ اس کے نتیجے میں وہ خود خوشحال ہوجاتا ہے اور دوسروں کو کامیابی کی طرف لے جاتا ہے"۔

اور مزید فرمایا: "ایسا شخص جو تم میں پختہ ترین دماغ رکھتا ہے وہ وہی ہوتا ہے جو اللہ سے سب سے زیادہ ڈرنے والا ہوتا ہے، جس کا اس نے حکم دیا ہے اس پر سب سے زیادہ عمل کرنے والا ہوتا ہے اور جس چیز سے اس نے منع کیا ہے اس سے باز رہنے والا ہوتا ہے، حالانکہ ایسا شخص ہوسکتا ہے کہ کم سے کم اطاعت کرنے والا ہو"۔

مفکرِ اسلام سید ابوالحسن علی ندوی رقمطراز ہیں: "ہمارے استاد مولانا عبد الباری صاحب ندویؒ فرمایا کرتے تھے کہ عقل جج نہیں بلکہ وکیل ہے، اس کو فیس ملنی چاہیے تو پھر یہ ہر مقدمہ کو ثابت کرسکتی ہے"۔ (دعوتِ فکر وعمل، صفحہ ۱۹۱)

انسان کو دیگر مخلوقات سے ممتاز کرنے والی سب سے بڑی نعمت عقل ہے۔ یہی وہ جوہر ہے جس کے بل پر انسان کائنات کے رازوں کو سمجھتا ہے، علوم و فنون میں ترقی کرتا ہے اور اپنی زندگی کو بامقصد بناتا ہے۔ عقل دراصل وہ روشنی ہے جو انسان کو صحیح اور غلط، خیر اور شر، نفع اور نقصان میں فرق کرنے کی صلاحیت عطا کرتی ہے۔ یہی وہ قوت ہے جس کے ذریعے انسان نہ صرف اپنی ذات کو پہچانتا ہے بلکہ اپنے خالق کی معرفت تک بھی رسائی حاصل کرتا ہے۔ قرآن کریم نے بارہا "أفلا تعقلون" کہہ کر عقل کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے، گویا اللہ تعالیٰ نے انسان کو غور وفکر اور تدبر کی دعوت دی ہے۔

بدقسمتی سے آج کا انسان علم وفہم میں تو آگے بڑھ گیا ہے لیکن عقل کی صحیح تربیت اور ارتقا پر توجہ نہیں دیتا۔ نتیجتاً وہ سائنسی ترقی کے باوجود اخلاقی پستی کا شکار ہے۔ اگر عقل کو وحی کی روشنی میں پروان چڑھایا جائے تو انسان نہ صرف ایک کامیاب فرد بلکہ ایک مثالی سماج کا معمار بھی بن سکتا ہے۔

لہٰذا وقت کا یہ تقاضا ہے کہ ہم عقل کو فروغ دیں اور اس میں قوت پیدا کریں۔ کیونکہ یہ وہ اثاثہ ہے جو ایمانی وعقلی کمال کی لامتناہی بلندیوں اور رفعتوں تک پہنچنے میں معاون ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں یہ ہمیں تباہی، بربادی اور تخریب سے محفوظ رکھتی ہے۔ یہ کہنا ہی کافی ہے کہ اس کے بغیر ہم مطلوبہ اہداف و محرکات کا حصول نہیں کرسکتے ہیں۔ البرٹ آنسٹائن کے الفاظ میں: "عقلی افزائش کا آغاز پیدائش سے شروع ہونا چاہیے اور موت ہی پر رکنا چاہیے"۔

بحث ونظر

شرعی احکام کی اصطلاحات-ضرورت واہمیت

ڈاکٹر محمد نصر اللہ ندوی (استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء)

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی بندگی کے لئے پیدا کیا، اور اس کو ایک مکمل ضابطہ حیات دیا، انسان کو جو احکام دیئے گئے ہیں، اس کے مختلف درجات ہیں، جن کو سمجھنا ایک مسلمان کیلئے از حد ضروری ہے، شریعت نے اس کیلئے کچھ اصطلاحات طے کی ہیں، جن سے احکام کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے، یہ اصطلاحات دین کیلئے بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں، اگر ان سے واقفیت نہ ہو تو ایک مسلمان کیلئے دین کے کسی حکم کی اہمیت کا اندازہ لگانا اور اس کو کما حقہ انجام دینا مشکل ہے۔

دین کے احکام کی درجہ بندی کیلئے فقہ وشریعت میں کچھ اصطلاحات مثلاً: فرض، واجب، سنت، مستحب، حرام، مکروہ وغیرہ استعمال کی جاتی ہیں، یہ اصطلاحات شریعت کے احکام کو سمجھنے اور سمجھانے میں معاون ومددگار ہیں۔

دین کے احکام ایک درجہ کے نہیں ہیں، بلکہ ان کے درمیان فرق ہے، مثلاً: نماز اور روزہ ہر مسلمان پر فرض ہیں، عیدین کی نماز اور وتر کی نماز واجب ہیں، شراب پینا اور سود کھانا حرام ہیں، سونے چاندی کے برتن میں کھانا اور بلا عذر جماعت چھوڑنا مکروہ تحریمی ہیں۔ ان احکام کے درمیان فرق صرف اصطلحات کے ذریعہ ہی سمجھا جاسکتا ہے۔

فقہاء نے انہی اصطلحات کے ذریعہ دین کے احکام کی تشریح وتوضیح کی ہے، فقہ کی کتابیں ان سے بھری پڑی ہیں، ان کے بغیر فقہی مسائل کی تشریح وتوضیح ممکن نہیں ہے۔ ان کو سمجھنا ہر مسلمان کے لئے ناگزیر ہے۔

ایک مسلمان جب یہ جانتا ہے کہ کس عمل کی کیا حیثیت ہے تو وہ اسی کے مطابق اس کا اہتمام کرتا ہے، مثلاً: اس کو معلوم ہے کہ نماز فرض ہے تو وہ اس کی ادائیگی کی سب سے زیادہ فکر کرتا ہے، نماز کے اوقات کے حساب سے وہ اپنے روزمرہ کے اعمال کی ترتیب بناتا ہے، اور اپنے تمام امور پر نماز کو مقدم رکھتا ہے، بسا اوقات نماز کی وجہ سے بعض کاموں میں تقدیم وتاخیر بھی کرتا ہے، تاکہ نمازیں متاثر نہ ہوں، اسی طرح زکوۃ کا مسئلہ ہے، مال پر سال گزرتے ہی اس کی ادائیگی کی فکر کرتا ہے، اپنے اخراجات کو کم کرکے اس کو نکالتا ہے، اس طرح غرباء ومساکین کا فائدہ ہوتا ہے، اور سال بھر وہ اس موقع کے انتظار میں رہتے ہیں، یہی حال دیگر فرائض کا ہے، ان کی انجام دہی کو مسلمان سب سے مقدم رکھتا ہے، اور ان کے لئے نہایت فکر مند رہتا ہے۔

یہ اصطلاحات نہ صرف اعمال کی ادائیگی کو آسان بناتی ہیں، بلکہ مسلمانوں کے اندر اتحاد واتفاق کی بھی علامت ہیں، مثلاً: جب فرض بولا جاتا ہے تو دنیا کے ہر خطہ میں بسنے والے مسلمانوں کے ذہن میں یکساں مفہوم آتا ہے، اور سب کے نزدیک اس کی اہمیت یکساں ہوتی ہے۔

الغرض شرعی اصطلاحات صرف الفاظ کا مجموعہ نہیں ہیں، بلکہ شریعت کے علمی نظام کا مدار اور فقہی واصولی مباحث کا مرکز ہیں، ان کے ادراک کے بغیر شریعت کی جامعیت اور اس کے احکام کی حقیقت کو سمجھنا ممکن نہیں ہے۔

ان اصطلاحات کی اہمیت اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ قرآن وحدیث کے نصوص میں ان کا استعمال کیا گیا ہے، ان نصوص کے فہم وادراک میں شرعی اصطلاحات کو مرکزی حیثیت حاصل ہے، ان کے ذریعہ امر ونہی کے مدارج طے کئے جاتے ہیں، اور مکلف کے عمل کی حیثیت واضح ہوتی ہے۔

قرآنِ کریم نے اپنے احکام وارشادات میں مختلف تعبیرات استعمال فرمائی ہیں، جیسے ''فرض'' کو کبھی كُتِبَ عَلَيْكُم (البقرة:183) کے الفاظ سے بیان کیا، ''حرام'' کے لیے حُرِّمَتْ عَلَيْكُم (المائدة:3) کی تعبیر استعمال کی ''واجب'' کے معنی کو أَوْفُوا بِالْعُقُودِ (المائدة: 1) کے ذریعہ بیان فرمایا، اور ''مستحب'' کے ذیل میں نبی کریم ﷺ کے وہ اعمال و اقوال آتے ہیں جنہیں امت کے لیے باعثِ فضیلت قرار دیا گیا۔

ان قرآنی تعبیرات کو منظم، مرتب اور مدون شکل میں امت کے سامنے پیش کرنے کے لیے علمائے امت نے فقہی واصولی اصطلاحات وضع کیں، تاکہ ہر درجہ کے مسلمان کے لیے دین کی تفہیم سہل اور یکساں ہوجائے۔

احادیثِ نبویہ میں بھی ہمیں شرعی اصطلحات کی بنیاد ملتی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''إنالحلال بين وإن الحرام بين وبينهما أمور مشتبهات'' (صحیح مسلم:1599)

یعنی حلال واضح ہے اور حرام واضح ہے، اور ان دونوں کے درمیان بعض مشتبہ امور ہیں۔

اس حدیثِ مبارک میں ''حلال''، ''حرام''

اور ''مشتبہ'' تین ایسے الفاظ استعمال ہوئے جو بعد میں فقہی مباحث کی بنیاد قرار پائے اور ان کی مزید تفصیل اصطلاحی انداز میں مرتب کی گئی۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بلاشبہ اللہ تعالی ارشاد فرماتے ہیں:

''من عادى لي ولياً فقد آذنته بالحرب، وما تقرّب إليّ عبدي بشيءٍ أحبّ إلي مما افترضتُ عليه، وما يزالُ عبدي يتقرّبُ إليّ بالنوافل حتى أُحِبَّه، فإذا أحببتُه كنتُ سمعَه الذي يسمعُ به، وبصرَه الذي يبصرُ به، ويدَه التي يبطشُ بها، ورجلَه التي يمشي بها، وإن سألني لأُعطينّه، ولئن استعاذَني لأُعيذنّه، وما تردّدتُ عن شيءٍ أنا فاعلُه تردّدي عن نفس المؤمن، يَكرهُ الموتَ وأنا أكره مَساءتَ''۔(البخاری، کتاب الرقاق، رقم: ٦٥٠٢)

''یعنی جو شخص میرے کسی ولی سے دشمنی کرتا ہے میری طرف سے اُس کو لڑائی کا اعلان ہے، اور میرا بندہ جن چیزوں کے ذریعے مجھ سے قرب حاصل کرنا چاہتا ہے اُن میں سب سے زیادہ محبوب چیزیں میرے نزدیک وہ ہیں جو میں نے اُس پر فرض کی ہیں (یعنی فرائض ادا کرنے سے سب سے زیادہ مجھ سے قرب حاصل ہوتا ہے) اور نوافل کی وجہ سے بندہ مجھ سے قریب ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اُسے اپنا محبوب بنالیتا ہوں، جب میں اُسے محبوب بنالیتا ہوں تو پھر میں اُس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنے، اور اُس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھے، اور اُس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ (کسی چیز کو) پکڑے، اور اُس کا پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلے (یعنی اس کا دیکھنا، سننا، چلنا، پھرنا، سب میری خوشی کے تابع بن جاتا ہے اور کوئی بات میری مرضی کے خلاف نہیں ہوتی)، اگر وہ مجھ سے کچھ مانگتا ہے تو میں اُسے ضرور عطا کرتا ہوں، اور اگر وہ کسی چیز سے پناہ چاہتا ہے تو میں ضرور اُسے پناہ دیتا ہوں، اور کسی چیز کے کرنے میں مجھے اِتنا تردد نہیں ہوتا جتنا تردد مومن کی روح قبض کرنے میں ہوتا ہے، وہ موت کو ناپسند کرتا ہے اور مجھے اسے غمگین کرنا ناپسند ہوتا ہے۔''

ان نصوص سے واضح ہوتا ہے کہ اصطلاحاتِ شرعیہ کا پس منظر براہِ راست قرآن وسنت سے وابستہ ہے، علماء نے ان کے مفاہیم کو نہ صرف منقح کیا بلکہ علمی ذخیرے میں ان کی جامع توضیح و تعریف پیش کی، تاکہ امت ہر دور میں نصوصِ شریعت کو صحیح طور پر سمجھ سکے، چنانچہ کہا جاسکتا ہے کہ شرعی اصطلاحات نصوص کی تعبیر کی کنجی ہیں۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں:

"لا يحيط أحد بالفقه حتى يعلم لسان العرب، وما وسعته لغتهم من المعاني والاصطلاحات." (الرسالة، ص:48)

یعنی: کوئی شخص فقہ میں کامل احاطہ نہیں کرسکتا جب تک کہ عربی زبان اور اس میں موجود معانی و اصطلاحات کو نہ جانے۔

امام غزالیؒ کا قول ہے:

''إنما يضيع الفقه لترك الاصطلاحات الشرعية، والخلط بينها وبين الاصطلاحات العرفية''۔(المستصفى: ١/١٠)

یعنی: فقہ ضائع اسی وقت ہوتی ہے جب شرعی اصطلاحات کو چھوڑ کر عرفی اصطلاحات سے خلط ملط کیا جاتا ہے۔

امام ابن قدامہؒ رقم طراز ہیں:

''الفقه علم بالأحكام الشرعية، ولا يُتصور ذلك إلا بمعرفة اصطلاحات الأئمة في بيانها''۔(روضة الناظر، 15/1)

یعنی: فقہ شرعی احکام کے علم کا نام ہے، اور یہ اس وقت تک تصور میں نہیں آسکتا جب تک کہ ائمہ کی اصطلاحات کو نہ سمجھا جائے۔

امام سیوطیؒ لکھتے ہیں:

''من لم يعرف الاصطلاحات وقع في الغلط الكثير''(الإتقان، 12/1)

یعنی: جو شخص اصطلاحات کو نہیں جانتا وہ کثرت سے غلطیوں میں پڑتا ہے۔

امام زرکشیؒ کا ارشاد ہے:

''الاصطلاحات كالحدود، من جهلها لم يفهم المراد من كلام العلماء۔''(البحر المحيط، 8/1)

یعنی: اصطلاحات حدود (تعریفات) کی مانند ہیں، جو ان سے جاہل رہا وہ علماء کے کلام کا صحیح مفہوم نہیں سمجھ سکتا۔

قاضی عیاضؒ کا ملفوظ ہے:

'' اصطلاح أهل العلم مفاتيح لفهم كلامهم، ومن جهلها تعذّر عليه الانتفاع بعلمهم''۔(ترتيب المدارك، 78/1)

یعنی: اہل علم کی اصطلاحات ان کے کلام کو سمجھنے کی کنجیاں ہیں، جو ان سے ناواقف رہا اس کیلئے ان کے علم سے فائدہ اٹھانا مشکل ہوگا۔

ان اقوال سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ شریعت کے صحیح فہم کے لیے اس کے اصطلاحات کو سمجھنا ناگزیر ہے۔ فقہ واصول کی عمارت انہی پر قائم ہے۔ ان سے غفلت علمی اغلاط اور عملی انحرافات کا سبب بنتی ہے۔

❁❁❁

ایک جائزہ

...ولکن شُبِّہَ لھم کی تفسیر-ایک جائزہ

سلمان نسیم ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء)

حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے رفع یا قتل و صلب کے سلسلہ میں قرآن نے اپنا موقف درج ذیل آیت میں پیش کیا ہے:

"وبکفرهم وقولهم علی مریم بهتاناً عظیماً، وقولهم انا قتلنا المسیح عیسی ابن مریم رسول الله وما قتلوه وما صلبوه ولکن شبه لهم وان الذین اختلفوا فیه لفي شك منه مالهم به من علم الا اتباع الظن وما قتلوه یقیناً، بل رفعه الله وکان الله عزیزاً حکیماً"۔ (سورہ نساء:۱۵۷)

ترجمہ: "اور یہود کے کفر کی وجہ سے، اور حضرت مریمؑ پر بہتان عظیم لگانے کی وجہ سے، اور ان کے اس دعوے کی وجہ سے کہ ہم نے مسیح عیسیٰ بن مریم اللہ کے رسول کو قتل کردیا، حالانکہ انہوں نے نہ اُن کو قتل کیا اور نہ ہی اُن کو سولی پر چڑھایا لیکن یہود کو اشتباہ ہوگیا، اور جو لوگ حضرت عیسی بن مریمؑ کے بارے میں اختلاف کرتے ہیں (کہ آیا وہ زندہ ہیں اور اٹھا لیے گئے یا مقتول و مصلوب ہوئے) وہ غلط خیال میں ہیں، ان کے پاس اس پر (حضرت عیسی بن مریمؑ کے مقتول و مصلوب ہونے پر) کوئی دلیل نہیں بجز تخمینی باتوں پر عمل کرنے کے، اور یہود نے یقینی بات ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کو قتل نہیں کیا بلکہ خدا نے ان کو اپنی طرف اٹھالیا، اور اللہ تعالیٰ بڑے زبردست ہیں حکمت والے ہیں"۔

'کیفیت تشبیہ' کی تعیین میں اختلاف و اضطراب

اس تحریر کا موضوع مذکورہ بالا آیت کا جز''... ولکن شبہ لھم: لیکن ان کو اشتباہ ہوگیا" ہے، اس پر تقریباً اتفاق ہے کہ ''شبه لهم'' میں "هم" کے اصل مصداق یہود ہیں جن کو حضرت عیسیٰؑ کی حیات و موت کے سلسلہ میں مغالطہ میں ڈالا گیا، پھر اُن سے متاثر ہوکر نصاریٰ بھی غلط فہمی کے شکار ہوئے، البتہ اللہ تعالیٰ نے تشبیہ (اشتباہ یا مغالطہ میں ڈالنے) کا کون سا طریقہ اختیار کیا؟ اس پر قرآن وحدیث میں کوئی تفصیل موجود نہیں ہے، اس موضوع پر جو بھی روایات و اقوال ہیں؛ ان میں اختلاف بلکہ تعارض ہے، اُن میں غور کرنے سے درج ذیل سوالات قائم ہوتے ہیں:

۱۔تشبیہ (اشتباہ/مغالطہ) حقیقی اور جسمانی تھی یا صرف تصوراتی اور نفسیاتی کہ یہود کو وہم ہوا کہ وہ حضرت عیسیٰؑ کو قتل کرنے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔

۲۔جس شخص پر حضرت عیسیٰؑ کی شباہت ڈالی گئی وہ 'طیطایوس' یہودی تھا یا 'سرجس' حواری، یا جیودس یا پھر کوئی اور عام شخص؟

۳۔اگر تشبیہ حقیقی یعنی جسمانی تھی تو حواری 'سرجس' سے شبیہ بننے کے لئے حضرت عیسیٰؑ نے مطالبہ کیا تھا یا وہ از خود اس کے لئے آمادہ ہوا تھا؟

۴۔گرفتاری کے وقت موجود یہود حضرت عیسیٰؑ کو پہچانتے تھے یا نہیں؟

۵۔گرفتاری کے وقت حضرت عیسیٰؑ صرف ایک حواری کے ساتھ تھے یا تمام حواری موجود تھے؟

۶۔اگر تمام حواری موجود تھے تو ان کی تعداد کیا تھی؟ دس، بارہ، تیرہ یا پھر سترہ؟

۷۔حضرت عیسیٰؑ کی شباہت کسی ایک پر ڈالی گئی یا سب کے سب حضرت عیسیٰؑ کی شبیہ بنادیے گئے؟

۸۔حضرت عیسیٰؑ کے شبیہ کی گرفتاری گھر کے اندر ہوئی تھی یا گھر کے باہر؟

۹۔پیش کردہ روایات سے واقعات کی منطقی ترتیب پر بھی بہت سے سوالات قائم ہوتے ہیں مثلاً:

۱۰۔تشبیہ کا یہ واقعہ کس وقت اور کس مقام پر پیش آیا؟ اور کیا اس کا کوئی عینی شاہد بھی تھا؟

۱۱۔عدالت کی کارروائی سے لے کر (مفروضہ) قتل وصلب کی جزئی تفصیلات کیا ہیں؟

مذکورہ بالا سوالات ان روایات واقوال کی روشنی میں کھڑے ہوتے ہیں جن کو متقدمین مفسرین نے حضرت ابن عباسؓ، وہب بن منبہ، عبدالصمد بن معقل، ابن اسحاق، قتادہ، سدی، اور مجاہد (رحمہم اللہ) سے نقل کیا ہے، ہر روایت کی تفصیلات دوسری روایت سے مختلف ہیں، اسی لئے امام طبریؒ نے لکھا کہ "واللہ أعلم أي ذلک کان"، اور علامہ آلوسی کو لکھنا پڑا کہ "وهذه الوجوه متعارضة متدافعة، والله أعلم بحقائق الأمور"۔

سکوت اور توقف

متقدمین ومتاخرین میں متعدد مفسرین نے

جیسے قرطبی، قاسمی، سمرقندی، شوکانی، ابن جزی غرناطی، اور اردو مفسرین میں حضرت تھانوی اور کسی حد تک مفتی شفیع دیوبندی (رحمہم اللہ) نے اس موضوع پر ان روایات واقوال کو نقل کرنے سے گریز کیا ہے، مولانا سید ابوالاعلی مودودیؒ جو درایت اور تقابل کے لئے معروف ہیں؛ لکھتے ہیں:

”...اب یہ معلوم کرنے کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ معاملہ کس طرح ان کے لیے مشتبہ ہوگیا۔ چونکہ اس باب میں کوئی یقینی ذریعۂ معلومات نہیں ہے اس لیے مجرد قیاس وگمان اور افواہوں کی بنیاد پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس شبہ کی نوعیت کیا تھی جس کی بنا پر یہودی یہ سمجھے کہ انہوں نے عیسیٰ ابن مریم کو صلیب دی ہے درآں حالانکہ عیسیٰ ابن مریم ان کے ہاتھ سے نکل چکے تھے۔“ (تفہیم القرآن: ۴:۱۵۷)

مولانا ابوالکلام آزادؒ اپنی تفسیر ”ترجمان القرآن“ کے پہلے ایڈیشن (۱۹۳۰ء) میں لکھتے ہیں کہ ”آیت میں جس اشتباہ کا ذکر ہے اس کے یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ حضرت مسیح کی شخصیت مشتبہ ہوگئی، اور ان کی جگہ کسی دوسرے آدمی کو سولی پر چڑھادیا، اور یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ حضرت مسیح کی موت مشتبہ ہوگئی، وہ زندہ تھے مگر انھیں مردہ سمجھ لیا، صدر اول سے لیکر آج تک جمہور مسلمانوں کا عقیدہ یہی رہا ہے کہ پہلی صورت پیش آئی“۔ (ترجمان القرآن: ۴:۱۵۷)

دوسرے ایڈیشن (۱۹۴۵ء) میں مولاناؒ نے کافی حذف واضافہ کیا ہے، اس میں مذکورہ بالا اقتباس کا آخری حصہ نہیں ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کیفیتِ تشبیہ کی کسی متعین صورت کو حتمی اور جمہور کا عقیدہ قرار دینے سے مولانا نے بھی رجوع کرلیا تھا۔

اختلاف واضطراب کی وجہ

اضطراب واختلاف کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ 'کیفیتِ تشبیہ' کا تذکرہ نہ قرآن میں ہے اور نہ حدیث میں، صحابہؓ میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت اور تابعین میں وہب بن منبہ، عبدالصمد بن معقل، مجاہد اور سدی (رحمہم اللہ) کے اقوال اس آیت کی تفسیر میں نقل کئے جاتے ہیں، حضرت ابن عباسؓ کی روایت کے علاوہ تمام اقوال سنداً ضعیف یا غریب ہیں، ابن کثیرؒ کے نزدیک حضرت ابن عباسؓ کی روایت راجح ہے، امام طبریؒ وہب بن منبہ اور عبدالصمد بن معقل کے قول کو ترجیح دیتے ہیں، ابن کثیرؒ ان دونوں حضرات کی روایتوں پر یہ تبصرہ فرماتے ہیں کہ: ”سیاق غریب جداً“، علامہ شوکانی فرماتے ہیں کہ اس موضوع کی بعض روایات اور انجیل میں بیان کردہ تفصیلات میں حیرت انگیز مماثلت پائی جاتی ہے۔

آیت کی تفسیر کے دو طریقے

اس صورتحال میں ”ولکن شبہ لھم“ کی تفسیر وتفہیم میں عموماً دو طریقے اختیار کئے جاسکتے ہیں:

۱۔ اس موضوع پر سکوت اور توقف اختیار کیا جائے، متقدمین ومتاخرین میں متعدد مفسرین نے اسی موقف کو ترجیح دی ہے۔

۲۔ ترجیح کا طریقہ اختیار کیا جائے جیسا کہ امام طبریؒ نے درایت کی بنیاد پر اور مفسر ابن کثیرؒ نے روایت کی صحت کی بنیاد پر ترجیح سے کام لیا ہے۔

تیسرا طریقہ

آیت کی تفسیر کا ایک طریقہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ فن استقراء کی مدد لی جائے، اور آیت کے سیاق و سباق، شرعی حس وشعور، تاریخی مطالعہ اور اور تحلیل و تجزیہ سے کام لے کر ایسی تفسیر پیش کی جائے جو قرآن، صحیح احادیث، اسلامی عقائد اور شریعت کے مسلمات سے متصادم نہ ہو، اس منہج تفسیر میں اگر مسلمہ تفسیری ضوابط وقواعد کو ملحوظ رکھا جائے تو ایسی تفسیر نہ صرف معتبر اور مقبول ہے، بلکہ ان ضعیف، مضطرب و متعارض موقوف اور مقطوع روایات پر مقدم ہوگی جن کا تعلق عقیدہ اور اصولِ اسلام سے ہو۔

'کیفیتِ تشبیہ' پر ایک نئی تحقیق

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ (۶ رجنوری ۱۹۷۷ء) نے منہج استقراء کی مدد سے کیفیتِ تشبیہ کو پیش کرنے کی بہترین کوشش کی ہے، مولانا دریابادیؒ کی تحقیق کی بنیاد (Circumstantial Evidence) یعنی اُن حالات وقرائن پر ہے جو مختلف اناجیل اور یہود ونصاری کے تاریخی مصادر کے مطالعہ سے ماخوذ ہے، مولاناؒ نے اس موضوع کو جس البیلے انداز میں پیش کیا ہے، وہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے، یہاں پوری بحث کو پیش کرنا ممکن نہیں ہے، اس لئے ان کی تحقیق کے صرف نمایاں نقاط پیش کئے جارہے ہیں:

□ گرفتاری 'شبیہ' کی نہیں بلکہ خود حضرت عیسیٰؑ کی عمل میں آئی تھی۔

□ گرفتاری کے بعد حضرت عیسیٰؑ کو رومی عدالت میں پیش کیا گیا تھا۔

□ رومی عدالت حضرت عیسیٰؑ کے خلاف فیصلہ سنانے سے گریز کرتی رہی جس کے معقول اسباب تھے۔

□ یہود نے شوروغوغا کرکے رومی عدالت کو حضرت عیسیٰؑ کے خلاف فیصلہ سنانے پر مجبور کیا تھا۔

□ حضرت عیسیٰؑ کو رومی عدالت سے قید خانہ کی طرف (جہاں سولی دی جاتی تھی) اِس حال میں لے جایا گیا کہ صلیب کی لکڑی ان کے کندھوں پر تھی، یہی اس وقت کا مروجہ قانون تھا۔

□ قید خانہ تک جانے والوں میں رومی عدالت

کے گارڈ، یہودی اور حضرت عیسیٰؑ کے علاوہ چند قیدی اور تھے جن کو پھانسی کی سزا سنائی گئی تھی۔

□ حضرت عیسیٰؑ جسمانی طور پر کمزور تھے، نیز صلیب کی لکڑی بھی کندھے پر تھی، اور راستہ میں یہودی شرارتی عناصر ان کو چھیڑتے جاتے تھے، جس سے ان کے کاندھے سے لکڑی گر گر جاتی تھی۔

□ صورتحال سے نپٹنے کے لئے رومی گارڈ نے یہودی بھیڑ میں سے ایک شخص (شمعون کرینی) کو پکڑ کر صلیب کی لکڑی اس کے کندھے پر لادی۔

□ جب یہ مجمع قید خانہ تک پہنچا تو رومی عدالت کی پولس کی ڈیوٹی ختم ہوگئی، اور وہ مجرموں کو جیل کے سپاہیوں کے حوالہ کرکے واپس ہوگئے۔

□ جیل کے سپاہی حسب دستور کہ 'جس کے کندھے پر صلیب وہی مجرم' کے تحت شمعون کرینی کو پھانسی دے دی۔

□ اسی افراتفری، اور شور و غوغا کے درمیان حضرت عیسیٰؑ کے رفع کا عظیم الشان واقعہ پیش آیا۔

موازنہ

متقدمین کی تفسیر اور مولانا دریابادیؒ کی تحقیق میں درج ذیل فرق نمایاں اور اساسی ہیں:

۱۔ متقدمین کے نزدیک 'تشبیہ' کا عمل جسمانی یا نفسیاتی تھا جبکہ مولانا دریابادیؒ کی رائے میں تشبیہ 'کنفیوژن'، 'اشتباہ' یا 'مغالطہ' کی صورت میں تھا۔

۲۔ متقدمین کے نزدیک گرفتاری 'شبیہ' کی ہوئی جبکہ مولانا دریابادیؒ کے نزدیک گرفتاری حضرت عیسیٰؑ کی ہوئی۔

۳۔ متقدمین کے نزدیک تشبیہ کا واقعہ حضرت عیسیٰؑ کے گھر میں پیش آیا جبکہ مولانا دریابادیؒ کی رائے میں یہ واقعہ جیل یا سولی گاہ میں پیش آیا۔

۳۔ متقدمین کے نزدی سولی 'شبیہ' کو جبکہ مولانا دریابادیؒ کے نزدیک 'شمعون کرینی' کو اس حال میں دی گئی کہ وہ اپنی اصل شکل میں موجود تھا۔

برصغیر کے متعدد اہل علم جیسے مولانا امین احسن اصلاحیؒ، مولانا محمد منظور نعمانیؒ نے مولانا کے اس موقف سے کلی یا جزوی اتفاق کیا ہے، مولانا مودودیؒ نے اس موضوع پر اگرچہ اصلاً سکوت اختیار کیا ہے لیکن ان کے بعض اشارے اس تحقیق کے بعض پہلوؤں سے اتفاق کرتے ہیں۔

اشکال

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی تحقیق پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ اگر پھانسی 'شمعون کرینی' کو دی گئی تو وہ بڑے آرام سے پھانسی پر کیسے چڑھ گیا؟ اور اگر شمعون کرینی اپنی اصل شکل میں تھا تو یہود حضرت عیسیٰؑ کے بجائے شمعون کرینی کی پھانسی کو کیسے ہضم کر گئے؟ اسی اشکال کو محسوس کرتے ہوئے مولاناؒ نے جواب دینے کی کوشش کی ہے:

"...اب یہاں سے جیل کے سنتریوں کا عمل دخل شروع ہوتا ہے۔ وہ کیا جانیں کہ یسوع ناصری کس کا نام ہے، وہ اپنے حسب دستور مجرم اسی کو سمجھے جس کے اوپر صلیب لدی ہوئی تھی... ایک مرتبہ پھر اس حقیقت کو مستحضر کرلیجے کہ جیل کے رومی سپاہیوں کے لئے سب یہودی اجنبی ہی تھے اور اس لیے باہم دگر ہم شکل اور یکساں، انہیں ایک اسرائیلی (یسوع ناصری) اور دوسرے اسرائیلی (شمعون کرینی) کے درمیان اشتباہ نہایت آسان تھا، انہیں دونوں کے درمیان کوئی نمایاں فرق ہی نہیں نظر آسکتا تھا، شمعون نے یقیناً واویلا مچایا ہوگا، لیکن ادھر مجمع کا شور و ہنگامہ ادھر جیل کے سپاہیوں کی اسرائیلیوں کی زبان سے ناواقفیت، اور پھر سولی پر لٹکا دینے کی جلدی، اسی افراتفری کے عالم میں اسی شمعون کو پکڑ کر سولی پر چڑھا دیا گیا، اور وہ چیختا چلاتا رہا، حضرت مسیحؑ قدرۃً اس ہڑبونگ میں دشمنوں کے ہاتھ سے رہا ہوگئے اور دشمن دھوکے میں پڑے ہوئے ٹامک ٹوئیے مارتے رہ گئے!"

(تفسیر ماجدی، ج اول: ۴: ۱۵۷)

مولانا دریابادی کی تحقیق کا مآخذ

یہود و نصاری اور دیگر اقوام یورپ کی مذہبی، سیاسی، علمی، نفسیاتی اور جذباتی تاریخ پر جیسی مبصرانہ اور مجتہدانہ نظر بیسویں صدی میں مولانا دریابادیؒ کی تھی، اس میں ان کے معاصرین میں کوئی شریک و سہیم نظر نہیں آتا جس کی دلیل ان کی انگریزی اور اردو کی تفسیر ہے، جس کے لئے انہوں نے توریت و انجیل کے علاوہ Warren Hastings کی 'ڈکشنری آف دی بائبل' (۵ر جلدیں) انسائیکلوپیڈیا ببلیکا Enc.Biblica (۴ر جلدیں)، جیوش انسائیکلوپیڈیا (۱۲ر ضخیم مجلدات)، لین کا مشہور 'مدالقاموس LEXICON' کا بغور مطالعہ کیا تھا، مذکورہ بالا تحقیق میں بھی غالباً مولانا دریابادیؒ کے پیش نظر (اگرچہ مولاناؒ نے اس کا حوالہ نہیں دیا ہے) وکیل اور چرچ ہسٹورین Alexander Taylor Innes (۱۸۳۳-۱۹۱۲) کی کتاب Trail of Jesus Christ:A Legal monograph رہی ہے، یہ کتاب T.&T.Clark کی طرف سے ۱۸۹۹ء میں شائع ہوئی تھی، مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے مطابق یہ کتاب مولانا دریابادیؒ کے پاس موجود تھی، اور اُنہی کی عنایت سے مولانا ندویؒ نے بھی اس کتاب کا مطالعہ کیا تھا، کتاب کے بارے میں مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ لکھتے ہیں: "مصنف نے قدیم رومی تاریخ، اور عدالتی کاغذات کی مدد سے اس وقت کے وہ ضابطے، قوانین اور روایات

جمع کردی ہیں' جن کے مطالعہ سے فرمان خداوندی "وماقتلوہ وماصلبوہ ولکن شبہ لھم" کی ایسی تصدیق ہوتی ہے' اور حضرت مسیحؑ کے مصلوب ہونے کی نفی وقرآن مجید کا اعجاز و صداقت روز روشن کی طرح سامنے آجاتی ہے"۔

(ماخوذ از مقدمہ تفسیر ماجدی جلد اول)

تدریجی توثیق

۱۹۴۵ء میں دوسری صدی عیسوی کا ایک مخطوطہ دستیاب ہوا ہے ، یہ مخطوطہ 'ناگ حمادی مخطوطات' کے کوڈیکس VII کا حصہ ہے، اور فی الحال قاہرہ کے کوپٹک میوزیم میں محفوظ ہے، دستیاب مخطوطہ کی زبان قبطی تھی، ماہرین کا خیال ہے کہ یونانی سے قبطی میں اس کا ترجمہ کیا گیا ہوگا، اس متن کا عنوان ہے(The Second Treatise of the Great Seth) ماہرین کا خیال ہے کہ اس متن کا مؤلف دوسری صدی عیسوی میں پایا جانے والا گنوسی عیسائی فرقہ کا کوئی فرد ہے، Taylor کی کتاب ۱۸۹۹ء، اور مولانا دریابادیؒ کی تفسیر کی پہلی جلد ۱۹۶۲ء میں شائع ہو چکی تھی، جبکہ اس مخطوطہ کے قبطی متن کی پہلی بار اشاعت ۱۹۷۲ء ہوئی، اور Roger Joseph A. Gibbons اور A.Bullard نے ۱۹۷۷ء میں اس مخطوطہ کا انگریزی ترجمہ پیش کیا، یہ متن مولانا دریابادیؒ کی مذکورہ بالا تحقیق کی توثیق مزید کرتا ہے، اور واضح طور پر' شمعون کرینی' کا نام لیتا ہے، اس متن میں مؤلف نے واقعہ کی تفصیل حضرت عیسیٰؑ کی زبانی پیش کی ہے، ہم ذیل میں اس متن کے متعلقہ حصہ کا ترجمہ پیش کرتے ہیں:

"انہوں نے اپنی گمراہی اور اندھے پن میں اپنے آدمی کو سولی دے دی۔ کیونکہ ان کے ارادے مجھے نہ دیکھ سکے، کیونکہ وہ بہرے اور اندھے تھے۔ لیکن جب انہوں نے یہ سب کچھ کیا، تو انہوں نے دراصل اپنے آپ کو مجرم ٹھہرایا۔ ہاں، انہوں نے مجھے دیکھا؛ انہوں نے مجھے سزا دی۔ مگر دراصل وہ کوئی اور تھا، ان کا باپ، جس نے کڑوی شراب اور سرکہ پیا؛ وہ میں نہیں تھا۔ انہوں نے مجھے سرکنڈے سے مارا؛ وہ کوئی اور تھا۔ شمعون تھا، جو صلیب اپنی پیٹھ پر اٹھا کر لے گیا۔ میں نہیں تھا، بلکہ کوئی اور تھا، جس کے سر پر انہوں نے کانٹوں کا تاج رکھا۔ لیکن میں تو بلند مقام پر خوشی منا رہا تھا، تمام آسمانی خزانوں کے ساتھ۔ اور میں ان کی نادانی پر ہنس رہا تھا"

(بصائر: د ہیثم طلعت، ج ۱، ص: ۲۶۸)

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اسی فرقہ اور اس کے عقیدہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"... خود مسیحیوں ہی کا ایک قدیم ترین فرقہ باسلیدیہ (Basilidian) کے نام سے گزرا ہے (بانی فرقہ کا سال وفات ۱۴۰ء) وہ... کھلم کھلا کہتا کہ مصلوب حضرت مسیحؑ نہیں ہوئے، بلکہ شمعون کرینی ہوا ہے، قرآن مجید نے اسی عقیدہ کی تصویب کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔"

انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا کے مطابق 'باسیلڈیز' اور 'گنوسس'؛ دونوں ایک ہی فرقہ ہیں، صرف 'باسیلڈیز' ہی نہیں بلکہ علامہ جورج سیل نے اپنے انگریزی ترجمۂ قرآن میں میں لکھا ہے کہ 'سیرنثیینز' (Cerinthians) اور 'کارپوکراٹیئن' (Carpocratians) بھی مروجہ عیسائی نظریہ کے خلاف نظریہ رکھتے تھے۔

❁❁❁

........بقیہ صفحہ ۲۸ /کا

اگر چرواہا ہی دشمن ہو تو بھیڑیے کو الزام کیوں دیا جائے؟"۔

واقعہ یہ ہے کہ جو امت کبھی "اسلام کے لیے جان نچھاور کرنے" میں مشہور تھی، وہ آج "سیمیناروں" کے انعقاد اور" قراردادیں " پاس کرنے میں مصروف ہے، جو مسلمان کبھی دنیا کی قیادت کرتے تھے، غلام قوموں کو آزاد کراتے تھے، تاریخ کا دھارا بدلتے تھے، آج محض باتوں اور بیانات کے دھنی ہیں۔ مولانا سید محمد واضح رشید ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مضمون کے اختتام میں لکھا:

"کیا اسلامی دنیا وسائل سے محروم ہے؟ کیا انسانی افرادی قوت کی کمی ہے؟ کیا اہلِ قیادت اور اہلِ علم موجود نہیں؟ کیا اسلحہ اور ہتھیاروں کا ذخیرہ نہیں؟ ہرگز نہیں! اسلامی دنیا ہر چیز میں مالا مال ہے، بس جس چیز کی کمی ہے، وہ ہے ارادہ، عمل، صدق و اخلاص اور ایسے حکمراں جن پر بھروسا کیا جا سکے، احتجاج اور جلوس کا طرزِ عمل دراصل کمزوری اور بے عملی کی دلیل ہے، تاریخ بتاتی ہے کہ ایسے اجلاسوں اور قراردادوں نے کبھی حالات نہیں بدلے۔ مسلمانوں کو دراصل کسی نئے اسلحہ ساز کارخانے کی نہیں؛ بلکہ "جذبہ قربانی" کی ضرورت ہے جو خریدا نہیں جا سکتا۔ یہی وہ متاعِ گم گشتہ ہے جو کبھی مسلمانوں کو زمین کا وارث اور تاریخ کا خالق بناتی تھی، یہی وہ جذبہ ہے جس نے عظیم مجاہدین اور فاتحین پیدا کیے جن پر ہم آج بھی فخر کرتے ہیں"۔

❁❁❁

عالم اسلام

تو مشق ناز کر، خونِ دو عالم میری گردن پر

غزہ میں صحافیوں کی شہادت - المناک حقائق

ڈاکٹر محمد فرمان ندوی (استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء)

ذرائع ابلاغ یا میڈیا دور حاضر کی بنیادی ضرورت ہے، وہ ایک معصوم آلہ ہے، جس کو خیر و شر، نفع و ضرر دونوں مقاصد کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے، با مقصد میڈیا صرف تعمیری اور مثبت پہلو رکھتا ہے، اور اس کو انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، لیکن زرخرید میڈیا ہمیشہ حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے، بے بنیاد واقعات کو عام کرنے، سستی شہرت حاصل کرنے اور روح وجذبہ سے عاری سرگرمیوں کو پھیلانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے، عالمی سطح پر میڈیا کے کردار کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ میڈیا پر اس وقت یہودی لابی کا زبردست اثر ہے، وہی رائی کو پربت بناتا ہے، اور چھوٹے واقعات کو بڑا بنا کر پیش کرتا ہے، اور بے حیائی اور بے شرمی کے فروغ میں غیر معمولی دلچسپی رکھتا ہے، یہ میڈیا خواہ پرنٹ ہو یا الیکٹرانک یا ڈیجیٹل اس کے انسانی معاشرہ پر منفی اثرات ہوتے ہیں۔

دو سال سے جاری غزہ کی سرزمین پر طوفان الاقصی میں دونوں میڈیا کا کردار سامنے آیا، زرخرید میڈیا نے حقائق پر پردہ ڈالنے کی انتھک کوشش کی، اور اسرائیلی جرائم اور نسل کشی کو ہلکا کر کے پیش کرنے کی متنوع تدبیریں کی، لیکن اللہ تعالی نے تعمیری میڈیا کے ذریعہ سارے واقعات کو ہر خاص و عام تک پہونچا دیا، اگرچہ اس سلسلہ میں اس کو بڑی قربانی دینی پڑی، اور سیکڑوں افراد سے محروم ہونا پڑا، حوصلہ مند، باہمت اور باغیرت صحافیوں کی ایک ٹیم نے اسرائیلی جارحیت کی پل پل کی خبروں کو عام کیا، اور اس کے ظلم و ستم، بلکہ منصوبہ بند نسل کشی کو طشت از بام کیا، اگر یہ ہمت و حوصلہ کے حامل افراد نہ ہوتے تو طوفان الأقصی کے حالات اس قدر تفصیل سے سامنے نہ آتے، اور عالمی سطح پر جو احتجاجات اور مظاہرے ہو رہے ہیں وہ بھی دب جاتے، یا پردۂ خفا میں چلے جاتے، اور مغربی ممالک میں باحمیت افراد مردوں، عورتوں اور نوجوانوں نے اسرائیلی ظلم کے خلاف جو قابل تعریف مظاہرہ کیا ہے، وہ بھی دنیا کی نگاہوں سے اوجھل ہوتا۔

قطر کے الجزیرہ چینل نے اپنے متعدد صحافتی نمائندوں کو غزہ کی سرزمین میں اتارا، وہ وہاں کے حالات احساس ذمہ داری کے ساتھ پوری دنیا کے سامنے لا رہے ہیں، اور غزہ کی تازہ صورت حال سے باخبر کر رہے ہیں، غزہ کی سرزمین پر ابھی تک صحافیوں اور میڈیا سے وابستہ افراد کا جو قتل عام ہوا ان کی تعداد تقریبا ڈھائی سو ہے، انہیں باحمیت افراد میں ۱۰/اگست ۲۰۲۵ء کو شہید ہونے والے انس شریف اور ان کی ٹیم کے افراد ہیں، جنہوں نے صحافیانہ عمل کو عبادت سمجھ کر انجام دیا، اور اور اللہ کی رضا کو پیش نظر رکھا، تیس سالہ انس شریف غزہ کے جبالیا کیمپ میں پیدا ہوا، اور ماس کمیونی کیشن کی ڈگری حاصل کی، اور اس میں اسپسلائزیشن کیا، ۲۰۱۴ء سے اس نے اپنے صحافیانہ عمل کا آغاز کیا، پہلے ایک عام صحافی کی طرح کام کیا، پھر دو سال قبل الجزیرہ چینل سے وابستہ ہوا اور پوری جرأت و ہمت سے رپورٹیں پیش کیں اور اجتماعی نسل کشی کو دنیا کے سامنے عام کیا، اس سلسلہ میں اس کو دھمکیاں دی گئیں اور خطرناک چیلینجز کا سامنا کرنا پڑا، یہاں تک کہ دس اکتوبر ۲۰۲۵ء کو اسرائیلی بم باری میں اسے شہید کردیا گیا، ان کے ساتھ صحافی محمد قریقع، ابراہیم ظاہر، اور محمد ریاض بھی تھے، اسرائیل نے اس ٹیم کو حماس کا حامی اور دہشت گرد کہا۔ ظاہر ہے کہ امریکہ اور اسرائیل کی نگاہ میں ہر وہ شخص دہشت گرد ہے، جو حق وصداقت کی تائید کرے اور اور انسانیت کی فلاح وبہبود کے لئے کام کرے۔

صحافیوں کی شہادت کا تازہ واقعہ ۲۶/اگست ۲۰۲۵ء کو النصر اسپتال پر اسرائیلی بمباری کے دوران پیش آیا، جس میں مریض، ڈاکٹروں، شہری دفاعی رضا کاروں سمیت چھ صحافیوں کی شہادت ہوئی، جن میں رائٹرز کا کیمرہ مین امین حسام المصری، امریکی خبر رساں ایجنسی اے پی اور برطانوی اخبار انڈپنڈنٹ کی نامہ نگار مریم ابودقہ، امریکی ٹی وی این بی سی کا صحافی معاذ ابوطلحہ، الجزیرہ کا جرنلسٹ محمد سلامہ، اور قدس نیٹ ورک کا صحافی احمد ابوعزیز قابل ذکر ہیں، خبروں کے مطابق الجزیرہ کے جرنلسٹ محمد سلامہ کا ابھی چند دن بعد ہالہ عصفور سے عقد نکاح ہونے والا تھا، لیکن اس ظالمانہ حملے میں وہ بھی شہید ہوئے۔

شہیدہ صحافی مریم ابودقہ نے شہادت سے

پہلے اپنے بیٹے غیث کو ایک خط لکھا تھا، جس میں اس نے کہا کہ غیث! تم اپنی ماں کا دل اور جان ہو، میرے بعد رونا نہیں، بس میرے لئے دعا کرنا، تاکہ مجھے سکون کی زندگی مل سکے، غیث! تمہاری نماز ہی اصل تمہاری طاقت ہے، سب سے بڑھ کر یہ کہ نماز کبھی نہ چھوڑنا، میری دعا ہے کہ تم ایمان، عزت اور کامیابی کے ساتھ بڑے ہو، محنت کرو، تعلیم میں کمال حاصل کرو۔

ایک دوسرے صحافی انس شریف جن کی شہادت ۱۰/اگست ۲۰۲۵ء کو ہوئی، اس نے اپنی شہادت سے پہلے ایک وصیت نامہ لکھا، اور اس کو اپنی شہادت کے بعد عام کرنے کی وصیت کی، اس وصیت نامہ میں اس کی زندگی کا آخری پیغام ہے، جو عالم اسلام کے مسلمانوں اور امن پسند حضرات کے لئے ایک گائڈ لائن بھی ہے:

"یہ میری وصیت ہے، اور میرا آخری پیغام ہے، اگر آپ تک یہ میرے الفاظ پہنچ جائیں تو یقین کیجئے کہ اسرائیل مجھے قتل کرنے، اور میری آواز کو دبانے میں کامیاب ہو گیا ہے، تو میں سب سے پہلے آپ کی خدمت میں ہدیہ سلام پیش کرتا ہوں، اللہ گواہ ہے کہ جو کچھ میں کوشش کر رہا ہوں وہ اس لئے ہے کہ میں اپنی مظلوم قوم کا سہارا بن سکوں، اور اس کی ترجمانی کر سکوں، میری آرزو یہ ہے کہ میری عمر دراز ہو، اور میں اپنے اہل خانہ اور رشتہ داروں کے درمیان لوٹ سکوں، اور عسقلان میں آزادی کی حالت میں سانس لے سکوں۔

میں نے رنج و الم کے کئی مرحلے طے کئے ہیں، اور تکلیف و مشقت سے بار بار دوچار ہوا ہوں، لیکن کبھی بھی میں حقیقت کی ترجمانی سے پیچھے نہیں رہا، اور میں نے بلا کم و کاست صحیح بات پہونچانے کی کوشش کی ہے، امید ہے کہ اللہ تعالی ان کے خلاف گواہی کے لئے کافی ہے جو خاموش بیٹھے ہیں، اور جو ہمارے قتل کے منصوبے بنا رہے ہیں، اور ہمارا محاصرہ کیا، اور ان کے ضمیر پر اُن خوفناک مناظر سے ذرا چوٹ نہیں لگی جو بچوں کے چیتھڑوں کی شکل میں تھے، اور انہوں نے قتل و غارت گری کو رکوانے کے سلسلہ میں دو سال کے دوران کوئی کوشش نہیں کی ہے۔

میں تمام مسلمانوں کو فلسطین کے سلسلہ میں وصیت کرتا ہوں، جو فلسطین مسلمانوں کے سروں کا تاج ہے، اور ہر مسلمان کے دل کی دھڑکن ہے، میں اس کے مظلوم و مقہور باشندوں، اور بچوں کے سلسلہ میں خیر کی وصیت کرتا ہوں، وہ بچے جو بن کھلے مرجھا گئے، اور ان کی تمنائیں ان کے دل میں دفن ہو گئیں، ان کے جسم بموں اور میزائلوں کی زد میں آئے، اور وہ ذرات کی طرح بکھر گئے۔

مسلمانو! میں تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ قید و بند سے نہ گھبرانا، اور زنجیروں اور بیڑیوں سے خوف نہ کھانا، فلسطین کی آزادی میں اپنا تن من دھن سب کچھ قربان کر دینا، تاکہ یہ ملک اس کے اصل باشندوں کے ہاتھ میں آئے، دیکھو مسلمانو! میرے اہل خانہ کا بھی خیال رکھنا، اگر میری موت آئی تو ان شاء اللہ محاذ پر میری ثابت قدمی کے ساتھ آئے گی، میں گواہی دیتا ہوں کہ میں اللہ کے فیصلہ پر راضی ہوں، اور اس سے ملاقات کا متمنی ہوں، اور مجھے یقین ہے کہ جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ بہتر ہے اور پائیدار ہے، اے میرے اللہ! مجھے شہادت نصیب فرما، اور میرے تمام گناہوں کو معاف فرما۔

اور اے مسلمانو! غزہ کو نہ بھولنا، اور مجھے بھی اپنی دعاؤں میں یاد رکھنا، آپ کا انس شریف"۔

انس شریف کا جسد خاکی اس کی شہادت کے بعد نمناک آنکھوں اور بھیگی پلکوں کے ساتھ قبر کے حوالہ کر دیا گیا، ظاہری طور پر وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گیا، لیکن قرآنی الفاظ میں وہ زندہ ہے، اور معنوی طور پر وہ دلوں میں موجود ہے، اور ان کی یاد کبھی بھی قلب و دماغ سے غائب نہیں ہو گی، اس نے غیرت و خودداری کی عظیم مثال قائم کی ہے، دلوں میں ہمت و حوصلہ کی روح پھونکی ہے، اور دنیا کے لاکھوں کروڑوں صحافیوں کے لئے ایک قابل تقلید نمونہ چھوڑا ہے۔ اسے انس شریف! اللہ تیری روح پر سکینت نازل فرمائے، اور آسمان تیری قبر پر شبنم افشانی کرے اور فردوس کے کھڑکیاں سدا تمہارے لئے کھلی رہیں۔

بین الاقوامی قوانین میں صحافیوں اور میڈیا سے وابستہ افراد کا قتل ایک سنگین جرم ہے، میڈیا کا تحفظ انسانیت کے تحفظ کے ہم معنی ہے، اقوام متحدہ کا منشور ہو یا ملکوں کا مقامی دستور، ہر ایک میں صحافیوں کو پوری جسمانی، فکری اور نظریاتی آزادی دی گئی ہے، لیکن اسرائیل کی سنگ دلی اور اس کی حیوانیت اور بربریت ہے کہ اس نے قانون و دستور کی تمام حدیں پار کر لی ہیں، اور انسانی اقدار اور اخلاقیات کا اس کے یہاں کوئی اعتبار نہیں، وہ صرف طاقت و قوت کی زبان جانتا ہے، اور تباہی و بربادی کو پیش نظر رکھتا ہے، اس لئے اللہ کا تقدیری فیصلہ کہ طوفان الاقصی نامی انقلاب آیا، جس نے اسرائیل کو انسانیت کا درس دیا، اور اس کی ناقابل تسخیر طاقت کا جنازہ نکال دیا، اور حماس کے مجاہدین برابر اپنی قربانیوں اور سرفروشیوں کے ذریعہ اس کے بزدلی و کمزوری کو سامنے لا رہے ہیں، ہو سکتا ہے کہ وہ ہوش کے ناخن لے اور نیل سے فرات کا دعوی ترک کر دے یا اپنی تباہی کے لئے دن گنتا رہے۔

لعل اللہ یحدث بعد ذلک أمراً.

ذکرِ رسول

محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انسانِ کامل

محمد سمعان خلیفہ ندوی (استاذ جامعہ اسلامیہ، بھٹکل)

انسانوں کی اس دنیا میں بہت سارے انسان آئے، اپنے فضل میں یگانہ، اپنے کمال میں یکتائے زمانہ، مصلحین آئے، مدبرین آئے، موجدین آئے، مکتشفین آئے، حکماء آئے، فلاسفہ آئے، شعراء آئے، فاتح آئے، کشور کشا آئے، حکمراں آئے، فرماں روا آئے، مگر کون ہے کہ ”رحمۃ للعالمین“ کا تاج اُس کے سر پر سجے آئے دنیا میں بہت پاک مکرم بن کر مگر آیا نہ کوئی رحمتِ عالم بن کر کفر کی شبِ سیاہ تھی، ظلمتوں کی سیاہ تھی، ہر سو تاریکی تھی، دنیا پیاسی تھی، نوعِ انساں ترس رہی تھی نگاہِ رحمت کے لیے، شادابی اور برکت کے لیے، روئے زمین پر انسان نہ تھا، انسان کی صورت میں حیوان تھا، بلکہ حیوان بھی انسان کے لیے پشیمان تھا، اسی شبِ دیجور میں افقِ عالم پر ”ماہ تابِ رحمت“ ماہِ تمام بن کر چمکتا ہے اور فضا بدل جاتی ہے، آسمان بدل جاتا ہے، ”رحمت کا بادل“ برستا ہے اور خدا کی ساری کھیتی ہری ہو جاتی ہے، پھر اس سے نہ آبی محروم رہتے ہیں نہ خاکی، پوری دنیائے انسانیت میں بہار آجاتی ہے، انسانیت کا سر اونچا ہو جاتا ہے کہ آج ”انسانِ کامل“ کی آمد آمد ہے۔

”دنیا کے ہر انسان کو فخر کرنا چاہیے کہ ہماری نوعِ انساں میں ایک ایسا انسان پیدا ہوا جس سے انسانیت کا سر اونچا اور نام روشن ہوا، اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہ آتے تو دنیا کا نقشہ کیا ہوتا؟ اور ہم انسانیت کی شرافت وعظمت کے لیے کس کو پیش کرتے؟ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر انسان کے ہیں، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اِس دنیا کی رونق اور نوعِ انسانی کی عظمت ہے، وہ کسی قوم کی مِلک نہیں، اُن پر کسی ملک کا اجارہ نہیں، وہ پوری انسانیت کا سرمایۂ فخر ہیں، کیوں آج کسی ملک کا انسان فخر و مسرت کے ساتھ یہ نہیں کہتا کہ میرا اُس نوع سے تعلق ہے جس میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جیسا انسانِ کامل پیدا ہوا۔“

(کاروانِ مدینہ: از حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی/ص ۶۷)

”انسانِ کامل“ ”رسول کامل“ بن کر آیا اور دنیا میں انقلاب آگیا، زمانہ بدل گیا، رت بدل گئی، ہوا کا رخ بدل گیا، انسان کو صحیح رخ مل گیا اور اُس کی صلاحیتوں کو صحیح سمت مل گئی، انسانیت کی چول جو کل تک اپنی جگہ سے کھسکی ہوئی تھی، صحیح جگہ بیٹھ گئی، انسان انسان بن گیا، دنیائے دنی کا تعلق ملائے اعلیٰ سے جڑ گیا، خالقِ کائنات کی نگاہِ لطف و مہر کائنات کی طرف متوجہ ہوئی، ”وحدتِ رب“ ملی، ”وحدتِ اَب“ ملی، عدل و انصاف ملا، چین و سکون ملا، انسانیت کے تن نازک میں شاہیں کی روح بیدار ہوئی، غم کو مداوا ملا، درد کو درماں ملا، جسم و جاں کے روگ دور ہوئے، تہذیب و تمدن کی الجھنیں کافور ہوئیں، یہ سب اُسی ”انسانِ کامل“ کی آمد کا فیض تھا جو سب سے کامل، سب سے مکمل تھا، حسنِ صورت، حسنِ سیرت، حسنِ انسانیت اور حسنِ نبوت کا سب سے حسین شاہکار تھا (اس لیے کہ اس کی پرورش حسن کے خالق نے کی تھی، أَدَّبَنِي رَبِّي فَأَحْسَنَ تَأْدِيبِي، جو شہِ انبیاء تھا، سرگروہِ اصفیاء تھا، جو خلق کا داور تھا، خالق کا آخری پیغام بر تھا، جو دانائے سبل تھا، ختمِ رسل تھا، جس کی شخصیت ماہِ تمام تھی، جس کی ذات مسکِ ختام تھی، جس کا نقشِ نقشِ دوام تھا، جس کا فیضِ فیضِ عام تھا، وہ کہ جس کا جمال زینتِ محفلِ حیات اور جس کے کوچے کا غبار سرمۂ چشمِ کائنات ٹھہرا، وہ جس کے کردار کی عظمت کی گواہی خلاقِ عالم نے دی، جس کے حسنِ خلق کی شہادت قلمِ تقدیر نے کتابِ ازل میں ثبت کر دی، اندھیروں کی حکومت میں تجلی کا وہ ”سفیر“، شہنشاہی بھی جس کے پاؤں چومے وہ ”فقیر“، وہ کہ جس کی ذات وجہِ تخلیقِ کائنات، جس کی زلفِ تاباں معراج کی حسیں رات، وہ کہ جس کو ”کوثر“ کا مژدۂ جاں فزا ملا، وہ کہ جس نے ”رفعِ ذکر“ کی نویدِ دل کشا پائی، ”سدرۃ المنتہیٰ“ جس کی رہ گزر اور ”قاب قوسین“ جس کی گردِ سفر میں، جبریل کے پر جس مقام پر جلے اُس کی حقیقتوں کا شناسا، بارگاہِ لامکاں میں بار پانے والا وہ رہ نوردِ جادۂ اسریٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)۔

وہ سراپا نور و نکہت، وہ سراپا سرور محبت، وہ سراپا مہر و رحمت، وہ سراپا محبت و محبوبیت، وہ سراپا عدل و انصاف، فکر و نظر کی بلندی کی تاج اسی کے لیے زیبا، کردار و گفتار کے حسن کا جامہ اسی کے وجود پر سجتا ہوا، وہ مجسم اخلاق، وہ پیکرِ صدق و صفا، وہ

مخزنِ مہر و وفا، وہ منبعِ خیر و سخا، وہ معدنِ اکرام و عطا، حضور پُرنور (روحی فداہ) کی ذات والا صفات ہے۔

یہ وہ انسانِ کامل تھا جس کی ذات کو پہلے جملہ کمالاتِ انسانیت پھر جملہ کمالاتِ نبوت سے نواز کر دستِ قدرت کے ذریعے جملہ اوصاف سے سجا کر منظر پہ لایا گیا اور اس کو انسانوں کے لیے نمونہ بنایا گیا، ہاں انسانوں کے لیے، جو انسان بن کر رہنا چاہتے ہیں، جو آدمیت کو وجہِ کمال سمجھتے ہیں، جو انسان ہونے پر فخر محسوس کرتے ہیں، جو انسانیت کو اپنی ترقی کی معراج سمجھتے ہیں، قیامت تک آنے والے ایسے انسان اگر کمال حاصل کرنا چاہتے ہیں اور سچی خوشیوں سے اپنے دامنِ مراد کو بھرنا چاہتے ہیں اور حقیقی معنوں میں انسان بننا چاہتے ہیں وہ "انسانِ کامل" ﷺ کی سیرتِ کاملہ وجامعہ کے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ لیں۔ مگر وہ جو انسانیت کو ایک عار سمجھتے ہیں، جو لباسِ انسانیت کو تار تار کرتے ہیں، جو خود انسانیت کے نام پر ایک کلنک اور بدنما داغ ہیں، جو انسانیت کے لباسِ زینت کو اپنے اوپر سے اتار پھینکنا چاہتے ہیں اور پھینک بھی چکے ہیں، اُنھیں انسانِ کامل ﷺ کے کمالات کی روشنی اچھی نہیں لگتی تو ماتم کریں اپنی کم مائیگی اور کوتاہ بختی کا، سر پیٹیں اپنی بے ضمیری پر، کوسیں اپنی درندگی کو، اور واپس کردیں انسانی رفعت کے اس تاجِ سروری کو جو اُس کے سر پر انسانِ کامل ﷺ نے رکھا تھا جسے انھوں نے اپنے پیروں سے روند کر خاک میں ملا دیا اور اپنی بہیمیت اور ہوس ناکی کی بھینٹ چڑھا دیا۔

یہ انسان نما مخلوق جو جانور بن کر اپنے وجود پر اتراتی ہے اور انسان ہونا اس کے لیے میسر نہیں، ان کی قیادت میں دنیا اپنے محسنِ اعظم ﷺ کے ساتھ کیا کچھ سلوک کر رہی ہے، عالم آشکار ہے (اور اسے ہماری حرماں نصیبی کہیے یا بدعملی کی سزا کہ ایسے دن دیکھنے کو ہم زندہ رہے)۔ پھر بھی اپنے سخت سے سخت دشمنوں کے ساتھ عفو و درگذر کا سلوک "رسولِ انسانیت" کا حسین گلدستہ آج بھی مہک رہا ہے، مشامِ جاں کو مہکا رہا ہے، رشکِ سمن اور جانِ چمن بن کر دامنِ دل کو کھینچ رہا ہے تاکہ زندگی کی حقیقی سانسیں رکھنے والے انسان اپنی زندگیوں کو معطر کرلیں، سیرت کا یہ مینارۂ نور صدا دے رہا ہے کہ ہے کوئی جو "آفتابِ رسالت" کی نوری کرنوں سے جہانِ دل میں اجالا کرلے اور ویرانۂ قلب کو آباد کرلے۔

انسانو! اس در کی دربانی اور اس چوکھٹ کی غلامی اختیار کرلو جس کی غلامی کے طوق گلے میں ڈالتے ہی آزادی کی اعلیٰ سے اعلیٰ رفعتیں تمھارا مقدر بن جائیں گی اور مایوسی کے سب دھندلکے چھٹ جائیں گے۔

انسانو! اس آبِ حیات کے قطرے منھ میں ڈال لو جس کو نوشِ جاں کرتے ہی تمھاری سب مشکلیں دور اور سارے غم کافور ہوجائیں گے۔

مان جاؤ کہ تمھارے مرض کی دوا یہی ہے، تمھارے درد کا درماں یہی۔ حرا سے ملنے والے اس نسخۂ شفا کو حرزِ جاں بنالو، تمھارے اجتماعی، قومی، معاشرتی، تہذیبی، تمدنی، سیاسی ہر طرح کے روگ ختم ہوجائیں گے اور سدا بہار جوانی اور صحت وکامرانی کا سرا ہاتھ آجائے گا۔

۞۞۞

نعتِ حبیبِ کائنات
صلوات اللہ وسلامہ علیہ

(از خاک پائے مصطفیٰ
محمد سمعان خلیفہ ندوی بھٹکل)

فضائے دہر میں یہ کس کا نام روشن ہے
یہ کس کے نام سے عالم تمام روشن ہے

نگر نگر میں ترا حسنِ تام روشن ہے
ترے جمال سے یہ صبح و شام روشن ہے

تری ضیا سے ہیں روشن تمام قندیلیں
ترے قدم ہی سے نقشِ دوام روشن ہے

غمِ حیات کی تلخی مجھے نہ کیوں بھائے
اسی سے ساغرِ عرفاں کا جام روشن ہے

چراغ تیری عنایت کا بجھ نہیں سکتا
زمانے بھر میں ترا فیضِ عام روشن ہے

اجالے تیری محبت کے ساتھ چلتے ہیں
اسی سے راستہ ہر ایک گام روشن ہے

کبھی سخن کو نہ روکے گا ظلمتوں کا ہجوم
چراغِ نعتِ نبی زیرِ بام روشن ہے

۞۞۞

حقوق وفرائض

عورت کی خود مختاری

غور وفکر کے چند پہلو

منور سلطان ندوی (رفیق مجلس تحقیقات شرعیہ ندوۃ العلماء)

گذشتہ دنوں دبئی میں ایک کانفرنس کا انعقاد ہوا، جس کو "اماراتی ومن کانفرنس 2025" کا نام دیا گیا، یہ کانفرنس اماراتی خواتین کی ذہانت، اور کردار کے حوالے سے تقاریر، ڈسکشن اور ایوارڈ پر مشتمل تھی، خواتین کو سماج میں مقام دلانے اور مرد کے شانہ بہ شانے لانے کے لئے اس طرح کی کانفرنسیں اکثر ہوتی رہتی ہیں، اس طرح کی کانفرنسوں کا مقصد خواتین کی آزادی، اور سماجی ومعاشی اعتبار سے ان کو خودمختار بنانے کی دعوت دینا ہوتا ہے۔

عورت کی خود مختاری (Women Empowerment) کا موضوع نیا نہیں ہے، یہ ایک علمی وفکری موضوع ہے، اور ایک سماجی مسئلہ بھی، ساتھ ہی ایک معاشرتی چیلنج بھی، ان پہلوؤں کے ساتھ یہ ایک خوبصورت اور پرفریب نعرہ بھی ہے، اس سے متعلق چند اہم پہلوؤں پر سنجیدگی سے غور کرنا ضروری ہے۔

خودمختاری کا مطلب ہے کہ عورت کو اپنی ذاتی زندگی، اور اپنے معاملات میں فیصلہ کا مکمل اختیار ہو، وہ اپنے معاملات میں کسی کے تابع نہ رہے، دراصل اس سے مقصود مرد وعورت کی صنفی برابری ہے، تاکہ عورت مرد کے شانہ بہ شانہ چل سکے، عورت اپنے فیصلوں میں بااختیار ہوگی تو وہ سماجی اور معاشی میدان میں بہترین کردار ادا کرے گی، اور اس طرح سماج اور ملک کی ترقی زیادہ ہوگی۔

مغرب میں فیمنزم کی جو مختلف لہریں اٹھیں انہیں میں عورت کی آزادی کا تصور بھی ہے، جو پہلے ذہنی وفکری آزادی اور قانونی مساوات تک محدود تھا، بعد میں تمام سماجی ومذہبی حدود سے آزادی اس اس میں شامل ہوگئی۔

مغرب کا تصور ایک ردعمل کے طور پر ابھرا، وہاں کا معاشرہ جن حالات سے دوچار تھا، اور کلیسا کی زنجیروں میں وہ جس طرح جکڑے ہوئے تھے اس پس منظر میں فیمنزم کی تحریک اٹھی، جس نے مذہبی اور سماجی پابندیوں کے خلاف بغاوت کی اور عورت کو آزادی دلانے کی کوشش کی۔

آزادی نسواں کی تحریک کے نتیجہ میں مغرب کلیسا کی زنجیر سے آزاد ضرور ہوگیا، مگر اس آزادی کی جو قیمت چکانی پڑی وہ جگ ظاہر ہے، سماجی و معاشرتی نظام کا بکھراؤ، معاشی آزادی کے نام پر عورت پر اپنی اور اپنے بچوں کی معاشی ذمہ داریاں، مرد وعورت میں مسابقت اور کشمکش، جنسی آزادی کے نام پر اخلاقی انارکی، ناجائز بچوں اور بغیر باپ کے بچوں کی بہتات، سماجی رشتوں کے کمزور ہونے کے نتیجہ میں تنہائی، ڈپریشن، اور ذہنی دباؤ میں بے تحاشہ اضافہ، اکیلی ماں (Single Parenting) کے نتیجہ میں سماجی مسائل اسی تحریک کے غیر معتدل اور غیر فطری سرگرمیوں کا خمیازہ ہے۔

اسلام نے روز اول سے عورت کو عزت دی، اور اس کو اس کا صحیح مقام عطا کیا، قرآن واحادیث میں تفصیلات موجود ہیں کہ عورت کو کس کس طرح کے حقوق دئے گئے ہیں، اور کس طرح انہیں خودمختار عطا کی گئی ہے۔

زندگی کے زیادہ تر معاملات میں عورت و مرد کی حیثیت برابر ہے، یعنی دونوں کے درمیان مساوات ہے، کسی طرح کا صنفی امتیاز نہیں ہے، اسلام میں عورت کو دینی، سماجی، معاشرتی، معاشی ہر طرح کے حقوق دئے گئے ہیں، بلکہ متعدد پہلو ایسے ہیں جہاں عورت کو مرد پر فوقیت حاصل ہے۔

عورتوں کے جو حقوق حاصل ہیں ان کا تذکرہ تفصیلی تحریر کا متقاضی ہے، خلاصہ کے طور پر چند باتوں کا ذکر کرنا مفید ہوگا:

عبادات میں مرد وعورت دونوں برابر ہیں: **من عمل صالحاً من ذكر أو أنثى وهو مؤمن فلنحينه حيوة طيبة ولنجزينهم أجرهم بأحسن ما كانوا يعملون** ۔ (سورہ نحل: ۹۷)

ترجمہ: مرد ہو یا عورت اگر مسلمان ہو تو جو بھی نیک عمل کرے گا ہم اس کی زندگی اچھی طرح بسر کرائیں گے، اور ہم ان کو اچھے کاموں کا اجر ضرور عطا فرمائیں گے۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب نے اس آیت سے یہ نکتہ اخذ کیا گیا ہے کہ عورت کو اپنی ذات اور اپنے مال میں خودمختاری حاصل ہے، جب تک کہ اس سے شریعت کا کوئی حکم نہ ٹوٹ جائے۔ (آسان تفسیر قرآن مجید)

جان ومال، عزو آبرو کا تحفظ، ایک دوسرے کے جذبات کا لحاظ میں مرد عورت دونوں کو یکساں درجہ حاصل ہے:

ولهن مثل الذى عليهن بالمعروف ۔ (سورہ بقرہ: ۲۲۸)

اور جیسے عورتوں پر مردوں کے حقوق ہیں ایسے ہی مردوں پر عورتوں کے حقوق بھی ہیں۔

عورت کو معاشی جدوجہد کی آزادی حاصل ہے، وہ تجارت کر سکتی ہے، ملازمت کر سکتی ہے، ہبہ اور وصیت کر سکتی ہے۔

معاشرتی آزادی وخودمختار کا یہ حال ہے کہ بالغ لڑکی کو نکاح کا فیصلہ کرنے کا اختیار ہے، باپ بھی لڑکی کی مرضی پوچھے بغیر اس کی شادی نہیں کر سکتا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لا تنکح الایم حتی تستامر ولاتنکح البکر حتی تستاذن۔ (صحیح البخاری)

مرد کی طرح عورت بھی میراث کی حقدار ہوتی ہے:

للرجال نصیب مماترك الوالدان والاقربون وللنساء مما ترك الوالدان والأقربون مماقل منه أو كثر نصيباً مفروضاً. (سورہ نساء: ۷)

والدین اور قرابت داروں نے جو کچھ چھوڑا ہے اس میں مردوں کا بھی حصہ ہے اور والدین اور قرابت داروں کے متروکہ میں عورتوں کا بھی حصہ ہے، چاہے وہ تھوڑا ہو یا زیادہ، یہ مقرر کیا ہوا ہے۔

اسلام میں عورت کا یہ مقام ہے کہ عورت کی تمام ذمہ داری مرد کے سر ہے، نابالغی کے زمانہ میں اس کی کفالت باپ کے ذمہ ہے، شادی کے بعد شوہر کے ذمہ، شوہر کے انتقال کی صورت میں بچوں کے ذمہ، اور بچے نہ ہوں تو قریبی رشتہ داروں کے ذمہ ہے، عورت پر خود اپنی ذمہ داری بھی نہیں ہے، اس کے باوجود انہیں معاشی آزادی حاصل ہے۔

اسلام میں جہاں عورتوں کو ہر شعبہ ہائے زندگی میں حقوق دئے گئے ہیں وہیں عورت کی فطرت کا لحاظ کرتے ہوئے حجاب اور عفت وعصمت کے عنوان سے اسے تحفظ بھی فراہم کیا ہے۔

پردے کے حدود دراصل عورت کی خصوصی حیثیت یعنی اضافی پروٹوکال ہے، جس پر عورت کو فخر کرنا چاہئے۔

اسلام نے عورتوں کو آزدی اور خودمختاری عطا کر کے سماج میں ایک انقلاب برپا کر دیا، جس کا نتیجہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مرد صحابہ علوم سیکھنے کو فخر محسوس کرتے تھے، حضرت شفا بنت عدویہ کو بازار کے مسائل پر اتنی مہارت رکھتی تھیں کہ حضرت عمرؓ نے انہیں بازار کا نگراں (انسپکٹر) بنایا تھا، فاطمہ الفہری نے جامعہ قرطبہ کی بنیاد ڈالی، تفسیر وحدیث اور دیگر علوم کی شاندار خدمت کی، غرض مسلم خواتین نے علمی وسماجی میدان میں جو کردار ادا کیا ہے وہ تاریخ کا روشن باب ہے۔

اسلام کے عطا کردہ حقوق کا موازنہ مغرب کے عطا کردہ حقوق یا متمدن معاشرہ میں عورت کو ملنے والے حقوق سے کیا جائے تو ہر منصف آدمی یہی کہے گا کہ اسلام میں عورتوں کو جس مقام تک پہونچایا ہے اور اسلام جس طرح کا متوازن معاشرہ تیار کرتا ہے، اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔

لیکن اسلام کی اس روشن تاریخ کے ساتھ یہ بھی ایک تلخ سچائی ہے کہ مسلم معاشرہ میں عورتوں کو وہ حقوق نہیں ملے جو انہیں مذہب نے عطا کیا تھا، روایات کے نام پر یا عورتوں کے تحفظ کے نام پر انہیں وہ خودمختاری نہیں ملی جن کی وہ حقدار تھیں، اس طرح عورتوں کے ساتھ معاشرتی زندگی میں کچھ زیادتیاں بھی ہوئی ہی، اور آج بھی ہو رہی ہیں، مگر اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا صحیح نہیں ہوگا کہ ہر خاندان میں اسی طرح ہو رہا ہے، کیونکہ ہر جگہ ایسا ہوتا تو مسلم خواتین کی تاریخ اتنی روشن نہیں ہوتی۔

عورتوں کو ان کے حقوق سے محروم کرنے میں عورت کے حدود کی تعبیر میں بیانیہ کا بھی بڑا دخل ہے، بعض اہل علم نے عورتوں کے تحفظ، فتنہ کے اندیشوں کو بنیاد بنا کر عورتوں کی سرگرمیوں کو اتنا محدود کر دیا کہ ان تحریروں کے نتیجہ میں مسلم عورت کی جو تصویر بنتی ہے وہ اسلام کے بنیادی اصول اور اسلام کی تاریخ سے کہیں میل نہیں کھاتی۔

عورت کا اصل میدان نسل انسانی کی تربیت ہے، مگر اسے شرعی حدود میں رہتے ہوئے معاشی جدوجہد کی آزادی ہے، بالغ لڑکی کو نکاح کے بارے میں اپنے فیصلے کا اختیار ہے، عورت کو میراث میں مرد کی طرح حقدار بنایا گیا ہے، اس طرح کے متعدد مسائل ہیں جہاں شریعت میں واضح ہدایات موجود ہونے کے باوجود عورتوں کے ساتھ ناانصافی ہوتی ہے۔

مذکورہ تفصیلات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مسلم عورت کو پہلے سے ہی خودمختاری حاصل ہے، انہیں وہ تمام حقوق حاصل ہیں جن کی وہ حقدار ہیں، پھر مسلم عورتوں کو خودمختاری کا سبق کیوں پڑھایا جاتا ہے، مسلم معاشرہ میں عورتوں کے حقوق کی دہائی کیوں دی جاتی ہے؟ ایک مسلم ملک میں اس طرح کے پروگرام کا مقصد کیا ہے؟

اگر کانفرنس کا مقصد مغرب کے تصور آزدی کو پیش کرنا ہے، مذہب کے مقابلہ میں فیمینزم کو رکھنا اور اور اسے پرکشش انداز میں پیش کرنا ہے، تو اس طرح کی سرگرمیوں کی اجازت نہیں ہونی چاہے، لیکن اگر مقصد عورت کے حقوق کو اجاگر کرنا ہے، عالمی بیانیہ کا جواب دینا ہے، سماجی وتعلیمی ترقی کا فروغ ہے، عورت پر ہونے مظالم مثلاً گھریلو تشدد، ....

بقیہ صفحہ ۴۵ پر

یقین محکم

انسانی زندگی میں صبر و شجاعت

محمد جاوید اختر ندوی (استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء)

موجودہ حالات میں جب کہ دشمنانِ اسلام ہر طرف سے اسلام اور مسلمانوں کو بدنام کرنے کی ہمہ تن کوششیں کر رہے ہیں، ضروری ہے کہ ہر مومن صبر و شجاعت سے کام لے، کیونکہ اللہ تعالیٰ پر ایمان و یقین رکھنے والا شخص ابتلاء و آزمائش، مشاکل و مصائب پر صبر کرتا ہے، پیش آمدہ پریشانیوں پر شکوہ کرتا ہے اور نہ گلہ، اس لیے وہ اپنے پروردگار کے نزدیک صبر کرنے والا اور 'صابرین' کی صف میں شامل ہو جاتا ہے، 'صبر جمیل' صبر کی اعلیٰ اور عمدہ قسم ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اللہ تعالیٰ نے صبر جمیل کا حکم دیا تو آپ ؐ نے صبر کیا: "فَاصْبِرْ صَبْراً جَمِيلاً" [سورہ معارج: ۵] (آپ صبر جمیل اختیار کیجئے)، اسی طرح آپ ؐ کے پہلے انبیاء و رسل نے بھی صبر کیا، حضرت یوسف علیہ السلام کو جب ان کے بھائیوں نے کنویں میں ڈال دیا تو اس عظیم حادثہ پر حضرت یعقوب علیہ السلام نے صبر کیا اور فرمایا: "فَصَبْرٌ جَمِيلٌ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ" [سورہ یوسف:۱۸] (اچھا صبر ہی بہتر ہے، اور جو تم بیان کر رہے ہو، اس پر اللہ ہی مددگار ہے)، پھر جب انہیں یوسف علیہ السلام کے علاوہ اپنے دوسرے بیٹے بنیامین کی علیحدگی کا غم لاحق ہوا تو اس موقع پر بھی آپ نے فرمایا: "قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْراً فَصَبْرٌ جَمِيلٌ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَنِيْ بِهِمْ جَمِيعاً اِنَّهُ هُوَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ" [سورہ یوسف: ۸۳] (کہا: بلکہ تم نے اپنی طرف سے بات بنائی ہے، اب صبر ہی بہتر ہے، قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو میرے پاس پہنچا دے، وہی علم و حکمت والا ہے)۔

قرآن مجید میں صبر کا ذکر بہت ہے، اور 'صبر جمیل' کا ذکر تین بار ہے، علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے صبر کو تین قسموں میں منقسم کیا ہے، اللہ کی اطاعت پر صبر کرنا، اللہ کے نواہی کو ترک کر کے صبر کرنا، ان مصائب پر صبر کرنا جن سے خلاصی بندہ کے اختیار میں نہیں ہے۔

مصیبت اور خطرہ کے وقت انسان کا نہ گھبرانا، صبر کرنا اور ثابت قدمی کے ساتھ مقابلہ کرنے کا نام ہی دراصل شجاعت ہے، صبر بھی شجاعت ہی کی ایک قسم ہے، اس لیے کہ انسان کسی مصیبت میں گھر کر بھی حواس باختہ نہ ہو؛ بلکہ اسے پوری قوت کے ساتھ برداشت کرے تو یہ بھی اس کی بہادری اور شجاعت ہے، آدمی کے اندر جتنا زیادہ اللہ کا خوف اور اس کی ذات پر یقین ہوگا، اسی قدر اس کے اندر صبر واستقلال کا مادہ ہوگا، اس لیے شجاعت بھی مرد مؤمن کی صفت صبر کی طرح ایک اہم صفت ہے۔

شجاعت کا مطلب یہ نہیں کہ آدمی ہر وقت تلوار لے کر کھڑا رہے، اور بغیر سمجھے بوجھے اپنی بہادری جتانے لگے اور کسی خطرہ سے خائف نہ ہو، آدمی کی فطرت ہے کہ کوئی ڈر کا موقع ہوتا ہے تو اس کو ڈر لگتا ہے، کوئی خطرہ سامنے آتا ہے تو اس کا اثر طبیعت پر ضرور ہوتا ہے، ایسا ہونا شجاعت کے خلاف نہیں، شجاعت یہ ہے کہ خطرہ کو خطرہ سمجھتے ہوئے اس کو جھیل جانا، تکلیف کو تکلیف سمجھ کر اس پر صبر کرنا، کسی نقصان پر یا کسی حادثہ کی شدت کو خاموشی سے برداشت کر لینا، کوئی کتنا ہی زبردست دشمن اور مخالف سامنے پڑ جائے؛ لیکن اس کے مقابلے سے نہ گھبرانا اور جم کر اس کو شکست دینے کی تدبیر کرنا اور اس کے وار کو مردانگی اور بہادری کے ساتھ روک دینا، اسی کا نام شجاعت ہے، خدا چاہتا ہے کہ ایک مسلمان کے اندر بہادری کی یہ صفت زیادہ ہوتا کہ وہ ایک طرف تو خدا کی راہ میں پیش آنے والے ہر خطرہ کو برداشت کر سکے اور دوسری طرف دنیا میں زندگی گزارنے کے لیے جن جن مشکلات سے اسے دوچار ہونا پڑے، وہ ان کے مقابلے سے ہراساں نہ ہو، اس طرح ان مشکلات کے ہجوم سے نکل آئے کہ دوسرے لوگ اس کے طرز عمل کو اپنے لیے نمونہ بنالیں، دراصل شجاعت جو اسلام ایک مسلمان کے اندر پیدا کرتا ہے وہ حق بات پر قائم رہنا ہے، جو چیز حق اور صحیح ہو اس کو ماننا اور اس کا اظہار کرنا خواہ لوگ اس کے کتنے ہی مخالف کیوں نہ ہوں اور زمانہ کی رفتار سے مختلف ہی ہو؛ لیکن ایسے سخت اور نازک ماحول میں اعلان حق کی جرأت ہی شجاعت کہلاتی ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: سب سے بلند جہاد اس شخص کا ہے، جس نے ظالم بادشاہ کے سامنے کلمۂ حق کہا، چنانچہ صحابہ کرام رضوان علیہم اجمعین اور سلف صالحین کی تاریخ اس سے بھری پڑی ہے کہ انھوں نے کبھی حق بات کہنے میں کسی مصلحت کا خیال نہیں کیا، کسی حکومت کی پرواہ نہیں کی، ہر موقع پر حق کا اظہار کیا اور بے خوفی کے ساتھ ڈٹے رہے، ان پر کتنے ہی مصائب آئے مگر انھوں نے ان کا بڑی حکمت اور ثابت قدمی کے ساتھ مقابلہ کیا، اور صبر و شجاعت کے ذریعہ ان کو فتح نصیب ہوئی اور ان کے دشمنوں کی ذلت رسوائی ہوئی، آج بھی ہمیں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے ان ہی اوصاف سے متصف ہونے کی ضرورت ہے۔

رسید کتب

تعارف و تبصرہ

محمد اصطفاء الحسن کاندھلوی ندوی (استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء)

نام کتاب: **حضرت مولانا عبد الحلیم جونپوری رحمۃ اللہ علیہ**

مؤلف: عبد العظیم ندوی

ماضی کی وہ عظیم ہستیاں جن کو اللہ تعالی نے بڑی توفیق سے نوازا، اور جن کو احیاء دین و تعلیم و ارشاد کے میدان میں ان کی کوششوں اور محنتوں کی وجہ سے دنیا میں بڑی محبوبیت و مقبولیت ملی، اور آخرت میں بھی ان شاء اللہ ان کے درجات بلند ہوں گے، و لا نزکی علی اللہ احداً، ان عظیم ہستیوں میں ایک بزرگ و بابرکت ہستی حضرت مولانا عبد الحلیم صاحب جونپوری رحمۃ اللہ علیہ کی تھی، جن کے فیوض و برکات مشرقی یوپی بالخصوص جونپور، گورینی اور دیوریا وغیرہ کے علاقہ میں آج بھی محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ وہ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ، حضرت مولانا شاہ وصی اللہ الہ آبادی اور دیگر اکابرِ وقت کے منظورِ نظر رہے، ان کے اہم رفقاء درس میں مولانا محمد احتشام الحسن کاندھلویؒ، مولانا امیر احمد کاندھلوی سابق رئیس الاساتذہ مظاہر علوم سہارنپور، مولانا جمیل الرحمان صاحب امروہویؒ، اور مولانا نذیر حسن صاحب سہارنپوریؒ وغیرہم شامل تھے، وہ ہندوستان کے تین قدیم و عظیم دینی و تعلیمی ادارے، دار العلوم دیوبند، ندوۃ العلماء، اور مظاہر علوم سہارنپور کے رکنِ مجلس شوری رہے۔ ان کے شاگردوں میں دیگر بہت سے فضلاء و علماء کے علاوہ شیخ الحدیث مولانا محمد یونس جونپوری کا نام بہت نمایاں ہے۔

حضرت جونپوری رحمۃ اللہ علیہ ایک مجاہدِ اسلام، پایہ کے عالمِ دین اور اعلی اخلاق وصفات کے حامل شخصیت تھے۔ آپ کی حیاتِ طیبہ دین کی راہ میں جہدِ مسلسل اور پیہم قربانیوں سے عبارت ہے۔ تعلیم دین کے شعبہ میں آپ نے متعدد مدارس و مکاتب کی بنیاد ڈالی، جس میں ضیاء العلوم، جونپور اور ریاض العلوم گورینی نے بڑے رجالِ کار پیدا کیے، اور علماء و مصلحین اور دعاۃ و مرشدین کی ایک بڑی جماعت تیار کی، جن کا فیض دنیا بھر میں عام ہوا، اس کے علاوہ مجلہ 'ریاض الجنۃ' بھی آپ کی ایک یادگار ہے۔

اگر آپ اس ایجاز کی تفصیل جاننا چاہتے ہوں اور حضرت جونپوری علیہ الرحمۃ کی شخصیت وحالات سے کما حقہ واقف ہونا چاہتے ہوں تو اس کے لیے ان کے فاضل فرزند جناب عبد العظیم ندوی صاحب کی تالیف "حضرت مولانا عبد الحلیم صاحب جونپوری۔ میرے والد، میرے شیخ" کا ضرور مطالعہ کریں جو مدرسہ حلیمیہ رسول پور ضلع اعظم گڑھ سے شائع ہوئی ہے اور مولاناؒ کی شخصیت واحوال پر لکھی جانے والی اب تک کی سب سے مستند اور مفصل کتاب ہے۔ اور یہ استناد و تفصیل اس وجہ سے ہے کہ یہ ایک ایسی شخصیت کی لکھی ہوئی ہے، جو آپ کے فرزند ہیں، اور آپ کی زندگی کا ایک معتد بہ حصہ اپنی جزئیات کے ساتھ خود ان کی نگاہ میں ہے۔ کتاب کی تالیف کا اسلوب بھی عام تذکرہ نگاروں سے ہٹ کر یہ ہے کہ تمام معلومات صاحبِ سوانح کی 'یاد داشت' پر مبنی ہیں، اور سوانح نگار نے اپنی یادداشت سے سیاق و سباق قائم کر کے اس کی اہم تفصیلات کو ذکر اور مضامین کو مربوط کیا ہے۔

کتاب کل ۲۵/ ابواب پر مشتمل ہے، جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

ابتدائی پانچ ابواب میں خاندان، ولادت، تعلیم و تربیت کی تفصیلات مذکور ہیں، آگے کے ابواب میں عملی زندگی کے مشاغل کا ذکر ہے، جس میں تدریس، تبلیغ، مدارس کا قیام، عظیم اداروں سے وابستگی اور اندرونی و بیرونی اسفار شامل ہیں، چودھویں باب میں وفات و تدفین کے حالات ہیں، اور آگے کے ابواب میں تعزیت نامے، ازواج و اولاد، محسن شخصیات، تلامذہ، خلفاء و مجازین، اہم رشتہ داروں کا تذکرہ ہے، اور آخر کے چند ابواب اہم واقعات، اخلاق و عادات، افکار و ملفوظات، اور خطبات پر مشتمل ہیں۔

کل صفحات ۴۴۰ ہیں، کتاب مجلد اور طباعت خوبصورت ہے، مجوزہ قیمت ۵۰۰/ روپیہ ہے، رابطہ کے لیے یہ نمبر ہے: ۹۴۱۵۸۶۵۰۰۱

نام کتاب: **کچھ یاد رہا، کچھ بھول گیا**

مرتب: عبد العلی فاروقی

شہر لکھنؤ کی اک مشہور شخصیت، نامور خطیب، عالمِ دین، صاحبِ اسلوب انشاء پرداز اور خانوادۂ فاروقی کے معروف فرزند مولانا عبد العلی فاروقی کے پُر بہار قلم سے "کچھ یاد رہا، کچھ بھول گیا" کا دلچسپ عنوان لیے یہ مجلد کتاب کا نسخہ ہمارے دستِ مطالعہ میں ہے، جس میں انھوں نے زندگی کے جستہ جستہ واقعات کو ایسے حسین پیرایوں میں بیان کیا ہے کہ بس پڑھتے چلے جایئے، اور خوبصورت بیانیہ کا لطف اٹھاتے جایئے۔

"کچھ یاد رہا، کچھ بھول گیا" ایسے واقعات کے مجموعہ سے عبارت ہے جو مولانا موصوف اندرونِ خانہ

اہل وعیال واقرباء یا بے تکلف احباب کے سامنے ان کو محظوظ کرنے کی غرض سے وقتاً فوقتاً بیان کرتے تھے۔ یہ واقعات وہی ہیں جو خود ان کے ساتھ پیش آئے، کہیں سے پڑھے ہوئے یا سنے ہوئے نہیں ہیں کہ وہ کسی اور کے لفظ وتعبیر کے پابند ہوں، انھوں نے اپنی حس اور قوت ادراک سے ان واقعات کو جو معنویت بخشی ہے وہ انہی کا خاصہ ہے۔ ان واقعات میں خود مولانا موصوف کی حیاتِ مستعار کے بھی کئی اہم پہلو سامنے آگئے ہیں، خاندانی ماحول کی اچھی خاصی ترجمانی ہوگئی ہے، اور اس کے علاوہ تعبیر وانشاء کے دروس، مواعظ وحکم، تاریخ وعبر، شخصیات و تذکرے اور نہ جانے کیا کیا...... جس طرح کتاب کا موضوع متعین نہیں' اسی طرح اس میں مندرج مضامین کی تحدید بھی ممکن نہیں...... مناسب یہی ہے کہ قاری پر چھوڑ دیا جائے کہ وہ حسبِ لیاقت وحسبِ ذوق اپنے مطالعہ سے خود طے کرلے۔

مولانا موصوف مرنجاں مرنج شخصیت کے حامل ہیں، اور قصہ گوئی کا فن ان کو خوب آتا ہے؛ کیونکہ ان کے اندر جزء رسی اور نکتہ آفرینی کی بڑی صلاحیت ہے، زبانی طلاقت ولباقت اس پر مستزاد...... لہٰذا جب مولانا قصہ سنا رہے ہوں یا لکھ رہے ہوں تو سماعت و بصارت کو سوائے محظوظ ہونے کے کوئی چارہ نہیں رہ جاتا۔ علاوہ ازیں یہ فن بھی مولانا کو خوب آتا ہے کہ آپ بیتی کو وہ نہ جانے کب جگ بیتی بنا دیتے ہیں، اور جگ بیتی کو آپ بیتی، ان کا قلم قاری کو رُلا بھی سکتا ہے، اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی لا سکتا ہے۔

ان خصائص کی بنا پر امید ہے کہ مولانا کی یہ کتاب اپنی علمی، ادبی، فکری اور تاریخی فوائد کے ساتھ 'انشاء پردازی واسلوبِ بیان کی وجہ سے بھی اہلِ ذوق کی تسکین کا سامان بنی رہے گی۔

'مکتبہ البدر' کاکوری لکھنؤ سے شائع ہوئی ہے، قیمت مجوزہ ۳۰۰/روپیہ ہے، رابطہ کے لیے:
۹۴۱۵۷۷۵۰۴۴

نام کتاب: **علاماتِ قیامت**
مؤلف: محمد امین حسنی ندوی

سابق ناظرِ عام ندوۃ العلماء مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندوی رحمہ اللہ کے فرزند اور ان کے تربیت یافتہ جواں سال عالمِ دین محمد امین حسنی ندوی صاحب اپنی خاندانی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے اور اپنے اسلاف کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے تصنیف و تالیف کے میدان میں قدم رکھ چکے ہیں، اس سے قبل عرصہ سے وہ مضمون نگاری کرتے رہے اور دینی و علمی موضوعات پر اچھے مضامین تحریر کرکے تبلیغ و دعوت کا فریضہ انجام دیتے رہے، علاوہ ازیں ان کے کئی رسائل بھی مختلف موضوع پر سامنے آئے اور پسند کیے گئے۔ اب ان کے حسنی قلم سے باقاعدہ ایک علمی و تحقیقی کتاب ''علاماتِ قیامت۔ قرآن و حدیث کی روشنی میں' منصۂ شہود پر آئی ہے، جس پر ہم انھیں مبارکباد دیتے ہیں، اور دعا کرتے ہیں کہ:

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

'قیامت' کا قیام اب صرف اہلِ ایمان کا عقیدہ نہیں رہا، جنھوں نے اس کا علم کتاب وسنت سے حاصل کیا اور تصدیق کی؛ بلکہ مادی علم جس کو سائنس کہتے ہیں، وہ بھی آج بمشیتِ ایزدی اس بات کی تصدیق کر رہی ہے کہ کائنات کا وجود جو قوتِ کشش کے نظام پر مبنی ہے، اس قوتِ کشش میں مسلسل بڑھتے کھنچاؤ کی وجہ سے اپنی تباہی اور بربادی کی طرف تیز رفتاری سے جارہا ہے، اور گویا کائنات ایسے انجام کی طرف بڑھ رہی ہے جس سے کوئی عبرت بھی حاصل نہ کرسکے گا۔ وما ذلک علی اللہ بعزیز

عصرِ حاضر میں 'قیامت' کی بحث کوسمولوجی (علم الافلاک) کی جدید تحقیقات کی وجہ سے کیا مؤمن وکافر اور کیا ملحد وزندیق، ہر ایک کے لیے ایک لمحۂ فکریہ بن گئی ہے، اور اس پر پوڈ کاسٹس اور ریلز بنائی جارہی ہیں، سوشل میڈیا کے تمام پلیٹ فارمز پر ایک دنیا ہے جو اس موضوع پر بحث کرکے اپنے فالوورز کمارہی ہے۔

اس موضوع پر اپنے علم ومعلومات کا اظہار کرنے والے زیادہ تر ایسے لوگ ہیں جو کتاب وسنت سے زیادہ سائنس کا علم رکھتے ہیں، نتیجہ میں وہ کتاب و سنت کو سائنس کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں، اور ان کا مقصد بھی دعوتِ فکر وعمل نہیں ہوتا، اور یہ صالح مقصد نہ ہونے کی وجہ سے لوگوں میں بے چینی واضطراب اور قنوط ویاس کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے، جوکہ کتاب و سنت میں علاماتِ قیامت کو پیش کرنے کا ہرگز مقصد نہیں تھا۔ دوسری طرف ایسے لوگ بھی ہیں جنھوں نے بہت سی آیات واحادیث کی من مانی تشریح کی اور ان کے مسلم مفاہیم ومطالب کو بدل کر رکھ دیا ہے۔

اس پورے منظر نامہ میں ضرورت تھی کہ اس موضوع کو اس طرح پیش کیا جائے جو بجائے بے عملی اور دست اندازی کی طرف لے جانے کے؛ انسانوں میں بالخصوص مسلمانوں میں روحِ عمل پھونکے، اور ان کے اندر تقوی و پرہیز گاری پیدا کرکے آخرت میں خالقِ کائنات کا سامنے کرنے کے قابل بنائے۔ اس کے لیے سب سے مؤثر طریقہ یہی ہے کہ قرآن و حدیث میں مذکور علاماتِ قیامت کو ان کے صحیح ترجمہ اور مفہوم کے ساتھ پیش کیا جائے، اور وہی مدلول ومعنی بتائے جائیں جو معتبر ومستند اہلِ علم سے منقول ہوں۔

عربی زبان میں کئی کتابیں اس موضوع پر اچھی تحقیق کے ساتھ ملتی ہیں، اردو میں ابھی تک کوئی ایسی

کتاب نظر سے نہیں گذری تھی جس میں معتبر احادیث کو معتبر وضاحت کے ساتھ پیش کیا گیا ہو، یہ کام امین حسنی صاحب نے اپنے خالِ معظم ناظم ندوۃ العلماء مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی دامت برکاتہم کی رہنمائی میں عربی تصنیفات سے استفادہ کرتے ہوئے انجام دیا، اور اس موضوع کو ویسا پیش کیا جیسا کہ اس کو پیش کیے جانے کا حق تھا۔ انھوں نے علاماتِ قیامت سے متعلق جدید نظریات سے بالکلیہ گریز بھی نہیں کیا؛ بلکہ جو نظریات اقرب الی الصواب معلوم ہوئے ان کو بھی محتاط زبان میں بیان کر کے اس طرح کے موضوعات کو پیش کرنے کا اچھا اسلوب اختیار کیا۔

امید ہے کہ اس کتاب کا مطالعہ حصولِ مقصد کے لیے معاون ہوگا، اور لوگ اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔

۲۸۰ رصفحات کی یہ کتاب 'سید احمد شہید اکیڈمی' رائے بریلی سے شائع ہوئی ہے، اور ندوۃ العلماء ٹیگور مارگ، لکھنؤ کے قریبی کتب خانوں پر دستیاب ہے۔

رابطہ کے لیے: ۹۹۱۹۳۳۱۲۵۹

نام کتاب: **سچی باتیں**

مرتب: شارق علوی

کتاب کے مصنف اردو وانگریزی اور ہندی کے مایہ ناز صحافی جناب شارق علوی صاحب کا تعلق ندوہ واہلِ ندوہ سے دیرینہ ہے، انھوں نے نوعمری سے ہی پہلے مفکرِ اسلام مولانا علی میاں ندویؒ اور ان کے بعد مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ سے ربط وتعلق رکھا، اور ان حضرات کی صحبت سے مستفید اور فکر سے متاثر ہوئے۔ وہ ایک نیک طبیعت، دلِ دردمند کے حامل وحق گوئی سے متصف صحافی ہیں، اور عرصہ سے ندوہ سے شائع ہونے والے انگریزی ماہنامہ 'دی فریگرینس آف ایسٹ' کے مدیر ہیں۔

یہ کتاب ان کی حیاتِ مستعار میں پیش آنے والے چنندہ واقعات کا مجموعہ ہے، جو خوبصورت زبان میں دلچسپ اسلوب بیان کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں۔ ان واقعات میں سے بعض عبرت انگیز وسبق آموز ہیں، تو بعض حکمت واخلاق پر مبنی اور ادب وتہذیب کے آئینہ دار ہیں، جب کہ کچھ واقعات ایسے بھی ہیں جن سے بعض تاریخی حقائق منکشف ہوتے ہیں۔ اگر مجموعی اعتبار سے کوئی رائے قائم کی جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ اس کتاب پر 'انسانی اقدار' اور 'قومی یکجہتی' کی چھاپ ہے۔

'سچی باتیں' کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی مصنف نے 'واقعہ نگاری' کے بجائے 'واقعہ بیانی' کا حقیقت پسندانہ اسلوب اختیار کیا ہے، جس سے ان واقعات کو یک گونہ استناد کا درجہ حاصل ہوتا ہے، اور اس کی بنا پر قاری کا دل ودماغ واقعات کے اثر کو بلاتردد قبول کرتے ہیں۔

یہ کتاب 'ملک میں گرتی ہوئی تہذیبی روایات اور بقائے باہم کے تئیں بڑھتی ہوئی مایوسی کے دور میں' ہر ہندوستانی کو بلاتفریقِ مذہب وملت وبلاامتیاز مرد وزن وپیر وجواں دعوتِ مطالعہ دیتی ہے، اور اس ملک میں موروثی تہذیبی واخلاقی اقدار وروایات کی قندیلوں تلے بقائے باہم کے امکانات سے روشناس کراتی ہے، جب کہ اس کے کچھ مشمولات ایسے بھی ہیں جن میں مصنف موصوف نے بعض قدیم جرائم سے متعلق اپنی رپورٹنگ کے چند نمونے پیش کیے ہیں، جن سے ان کی صحافتی صلاحیت واسلوب واضح ہوتے ہیں۔

یہ اپنے حجم میں مختصر سہی، لیکن ہندی عوام کے لیے اس میں کافی کچھ نفع ہے۔ ضرورت ہے کہ اس موضوع کو وسعت بخشی جائے اور ملک کی مختلف زبانوں میں اس کی اشاعت کی جائے۔

'وکاس پرنٹنگ، لکھنؤ' سے شائع ہوئی ہے، 'دانش محل، امین آباد' و 'مولانا آزاد میموریل اکیڈمی' سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

.........بقیہ صفحہ ۴۱ کا

جبری شادی، تعلیم سے محرومی اور وراثت سے محروم کو اجاگر کرنا ہے، یعنی اسلامی فکر اور اسلام کے اعتدال کو فروغ دینا ہے، تو اس کا استقبال ہونا چاہئے۔

عام طور پر اس طرح کی سرگرمیوں کے پس پردہ مسلم عورت کو آزادی اور خودمختاری کے نام پر مذہب سے بیزار کرنے کا مقصد کارفرما ہوتا ہے، تاکہ وہ بھی مذہب کے طوق کو اتار پھینکے، اور مغرب کی طرح مشرق کی خواتین بھی دینی وسماجی بندھوں سے آزاد ہوکر اپنے وجود کو ثابت کریں۔

مغرب عورت کی مطلق آزادی کا قائل اور داعی بلکہ علمبردار ہے، اس آزادی کے نتائج سامنے ہیں، اس کے برخلاف اسلام عورت کو ایک محدود دائرہ میں آزادی عطا کرتا ہے، اس میں عورت کی عزت بھی ہے، اور اس کا وقار بھی، ساتھ ہی عورت کے اصل میدان کی تعیین بھی ہے، اور اولین فرائض کی جانب توجہ بھی۔

افسوس کہ بسا اوقات بعض مسلم قلمکار بھی اس معاشرتی نظام کو پدرشاہی نظام سے تعبیر کرتی ہیں اور اسے عار سمجھتی ہیں، حالانکہ یہ کھلی حقیقت ہے کہ عورت کے شتر بے مہار رہنے اور تنہا زندگی کے سرد وگرم کو جھیلنے سے بہتر ہے کہ وہ کسی کی ذمہ داری میں ہو، اور خاندان میں مرد کی مرکزیت ہو، محدود دائرہ میں آزادی وخودمختار اس آزادی سے بدرجہ بہتر ہے جہاں اس کا امتیازی وصف کھو جائے اور وہ عام انسان کی طرح معاشی دوڑ بھاگ کا حصہ بن جائے۔

وجودِ زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوز دروں

زیتون کی وادی میں بھوک کا نوحہ

محمد نفیس خان ندوی (استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء)

غزہ—وہ سرزمین، جہاں کبھی زیتون کے درخت لہلہاتے تھے، جہاں سمندر کی ہوائیں امن کے نغمے سناتی تھیں، آج وہی غزہ انسانی ضمیر کی سب سے بڑی آزمائش گاہ بنا ہوا ہے۔ یہاں گولیوں سے تیز رفتار بھوک ہے، بموں سے زیادہ ہولناک پیاس ہے، پانی سے ارزاں بہتا ہوا لہو ہے، اور آٹے کی بوریوں سے زیادہ بکھری ہوئی لاشیں ہیں! یہ موت وتباہی کا وہ منظر ہے جسے جدید دنیا جنگ کا نام دے کر نظر انداز کر رہی ہے، مگر حقیقت میں یہ ایک منظم نسل کشی ہے۔

جب معصوم بچوں کے جسم بھوک سے سوکھے پتوں کی مانند لرزنے لگیں، جب نانِ شبینہ کے لیے لگی قطاروں پر بارود کی بارش ہو، جب زندگی بانٹنے والے امدادی قافلے بھی موت کا نشانہ بن جائیں، جب پانی کے چند قطروں کے لیے معصوم کلیاں ایڑیاں رگڑتے رگڑتے خاموش ہو جائیں اور جب آنکھوں کے کنویں بھی سوکھ کر بوسیدہ ہو جائیں تو یہ جنگ، جنگ نہیں رہتی، یہ انسانیت کی تذلیل اور ظلم وبربریت کی وہ بدترین مثال بن جاتی ہے جو تاریخ کے ماتھے پر ہمیشہ کے لیے سیاہ ترین داغ بن کر چمکتی رہے گی۔

غزہ کی فضاؤں میں صرف بارود کا دھواں ہی نہیں، بھوک کا عفریت بھی ایک چڑھتے ہوئے مرغولے کی طرح انسانیت کا دم گھونٹ رہا ہے۔

غزہ کی گلیوں میں موت ہزار چہروں کے ساتھ اترتی ہے؛ کبھی امدادی ٹرک کے پاس ایک گولی زندگی کو چھین لیتی ہے، کبھی ایک نان کا ٹکڑا کسی کے ہاتھ میں آتا ہے اور وہ لمحے بھر میں جاں بحق ہو جاتا ہے، کبھی ایک معصوم بچہ خوراک کے ڈبے کی طرف لپکتا ہے اور اگلے ہی لمحہ اس کا بدن ٹکڑوں میں بٹ جاتا ہے، کچھ لوگ بھاگتی بھیڑ کے قدموں تلے کچل دیے جاتے ہیں، اور کوئی بوڑھا شخص قطار میں اتنا طویل انتظار کرتا ہے کہ لقمہ منہ تک پہنچنے سے پہلے اس کی روح پرواز کر جاتی ہے۔

بھوک صرف ایک کمی کا نام نہیں، یہ انسان کی جان، وقار اور امید کو نگل جانے والا وہ عفریت ہے جو آہستہ آہستہ جسم کو شکست دیتا ہے اور روح کو تھکا دیتا ہے۔ بھوک صرف جسم کو نہیں توڑتی، دماغ کو بھی اندھیروں میں دھکیل دیتی ہے، نیند غائب ہو جاتی ہے، توجہ بکھر جاتی ہے، حواس لڑکھڑانے لگتے ہیں۔ کبھی وہم، کبھی ڈر، کبھی پاگل پن، اور کبھی زور زور کی چیخیں سب بھوک کے عذاب کی نشانیاں ہیں۔

بھوک کے پہلے لمحہ سے ہی جسم چیخنے لگتا ہے، خون میں توانائی کا چراغ بجھنے لگتا ہے، ہونٹ سوکھ جاتے ہیں، چہرہ زرد پڑ جاتا ہے، چند دنوں میں چربی گھلنے لگتی، گوشت پگھلنے لگتا ہے اور پھر انسان کا وجود ہڈیوں کا ڈھانچہ بن جاتا۔ بھوک کا آخری مرحلہ سب سے زیادہ ہولناک ہوتا ہے؛ دل کی دھڑکن بے ترتیب ہو جاتی ہے، جگر اور گردے جواب دینے لگتے ہیں، اور انسان کا وجود سانسوں کی قید سے نکل کر موت کی آغوش میں چلا جاتا ہے

غزہ کے معصوم بچے جب روٹی کے ایک ٹکڑے کی تلاش میں دربدر بھٹکتے ہیں تو ان کی آنکھیں چیخ چیخ کر بتاتی ہیں کہ بھوک صرف جسم کو نہیں توڑتی بلکہ شعور کو بھی روند ڈالتی ہے۔

غزہ کی سڑکوں اور گلیاروں میں یہ چلتے پھرتے ڈھانچے دراصل انسانی ضمیر کے خلاف ایک خاموش مگر نہ ختم ہونے والا احتجاج ہیں، وہ احتجاج جس کی صدائیں کبھی وہائٹ ہاؤس کی سیاہ دیواروں سے ٹکرا کر پلٹتی ہیں، کبھی ایوانِ قومی میں سسکیاں بھرتی ہیں، کبھی اقوام متحدہ کی امن کونسل کا دامن تھامتی ہیں، اور کبھی عالمی میڈیا کے شور میں دب کر دم توڑ دیتی ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کمزور قدموں اور خالی پیٹوں کی آہ پوری انسانیت کے گلے میں وہ طوق بن چکی ہے جسے اتارنے کی جرات کوئی نہیں کر رہا۔ یہ احتجاج دنیا کے ہر ایوان، ہر ضمیر اور ہر طاقتور دروازے پر دستک دے رہا ہے کہ بھوک سے مرتا ہوا بچہ صرف ایک غزہ کا سانحہ نہیں، بلکہ پوری انسانی تہذیب کی ناکامی ہے۔

انسانی تاریخ کا یہ پہلا اور سب سے خوفناک منظر ہے، جہاں لاکھوں انسانوں کو گھیر کر ایک درندہ صفت قاتل کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا گیا ہے۔

اسرائیل نے غزہ میں نہ صرف بمباری اور محاصرے کا سہارا لیا ہے، بلکہ روٹی، پانی اور دوا تک کی رسائی کو روک کر انسانی بقا کے حق پر براہِ راست حملہ کیا ہے۔ اسرائیلی فوجیں ان کھنڈرات کو بھی نشانہ بناتی ہیں، جہاں صرف خوراک کی موجودگی کا شبہ تک گزر جاتا ہے۔ یہ جنگ نہیں، یہ انسانیت کے وجود پر براہ راست حملہ ہے۔

کہ غزہ کی اسی فیصد (80%) آبادی قحط کے دہانے پر ہے، ہزاروں بچے شدید غذائی قلت کا شکار ہیں، اور روزانہ درجنوں جانیں خوراک اور پانی نہ ملنے کے باعث ضائع ہو رہی ہیں۔

سلامتی کونسل کے اجلاس میں یہ اعتراف کیا گیا ہے کہ غزہ کے معصوم بچے اب نہ بولنے کی سکت رکھتے ہیں اور نہ رونے کی تاب! وہ خاموشی سے ملبوں اور خیموں کے فرش پر پڑے رہتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے ہڈیوں کے ڈھانچوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ بھوک اور بیماری ان کے کمزور جسموں کو اس طرح چاٹ رہی ہے جیسے تیزاب آہستہ آہستہ لوہے کو گھلا دیتا ہے۔ ان کے چہروں پر آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے اور پسلیوں کا ابھار بھوک کی اذیت ناک کہانی سنا رہا ہے۔

عالمی ادارۂ خوراک (WFP) اور اقوام متحدہ کی متعدد رپورٹس بتاتی ہیں کہ غزہ میں پانچ سال سے کم عمر کے تقریباً 95 فیصد بچے شدید غذائی قلت کا شکار ہیں، ہسپتالوں میں لائے گئے درجنوں بچے اس قدر کمزور ہو چکے ہیں کہ ان میں رونے تک کی طاقت باقی نہیں۔ ایک بین الاقوامی صحافی نے لکھا: ''غزہ کے خیموں میں ایسے بچے ملتے ہیں جن کی آنکھیں خالی گھڑوں کی مانند ہیں بی نہ آنسو، نہ آواز، صرف خاموشی۔''

یہ کوئی اتفاقی بحران نہیں بلکہ ایک سوچا سمجھا منصوبہ ہے؛ اسرائیل کے اعلیٰ حکام بارہا کہہ چکے ہیں کہ غزہ میں نہ بجلی کی سپلائی ہوگی، نہ پانی کی فراہمی ہوگی اور نہ خوراک کے پہنچنے کا نظم ہوگا۔ گویا اسرائیل کی طرف سے بھوک کو ایک جنگی ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے کا اعلان کر دیا گیا ہے، اس سے بڑھ کر بین الاقوامی قوانین اور انسانی حقوق کی خلاف ورزی اور کیا ہو سکتی ہے؟

دنیا کو یہ سمجھنا ہوگا کہ غزہ کی سرزمین پر جنگ صرف ہتھیاروں سے نہیں لڑی جا رہی ہے، بلکہ بھوک کو جدید اسلحہ کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے اور انسانیت کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اگر عالمی برادری نے اسی طرح خاموشی اختیار کی تو یہ طریقہ کل کو کسی اور خطے میں، کسی اور مظلوم قوم پر بھی آزمایا جا سکتا ہے۔

غزہ کے باشندے زندگی اور موت کے درمیان نہ جانے کتنی مرتبہ جیتے ہیں اور کتنی مرتبہ آخری سانسیں لیتے ہیں۔ جب پورا دن وہ موت سے لڑ کر کسی طرح اپنی سانسیں بچا لیتے ہیں تو رات کو آنے والے دن کی ہولناکی کا تصور ان کی آنکھوں سے نیند چھین لیتا ہے۔ یہ کوئی عام زندگی نہیں بلکہ ایک مسلسل اذیت ہے، ایک ایسی قید جس میں ہر لمحہ موت کی چاپ سنائی دیتی ہے۔ اس کرب انگیز حقیقت کا اندازہ ان چند بیانات سے لگایا جا سکتا ہے جو کبھی کبھار محاصرے کی دیواروں کو چیر کر دنیا تک پہنچ پاتے ہیں:

ستر سالہ وجیہ النجار کا کہنا ہے: ''ہم بھوک اور روزانہ کی اذیت میں جی رہے ہیں، قیمتیں اس قدر ہوشربا بڑھ گئی ہیں کہ کوئی بھی غزہ کا شہری، چاہے ملازم ہو یا بے روزگار، انہیں برداشت نہیں کر سکتا، یہ سب کچھ سمجھ سے باہر ہے۔ آٹے کی قیمت 35 اسرائیلی شیکل (74.7 پاؤنڈ) فی کلو سے بڑھ کر 180 اسرائیلی شیکل (80.39 پاؤنڈ) فی کلو تک جا پہنچی ہے۔

43 سالہ یونیورسٹی لیکچرار ایہاب عبداللہ کہتے ہیں: ''میں ہر رات سونے سے پہلے سوچتا ہوں کہ کل اپنے بچوں کو کھانے کے لیے کیا دوں گا؟ میں خود بھوک برداشت کر سکتا ہوں، لیکن اپنے بچوں کی بھوک نہیں دیکھ سکتا۔ یہ احساس مجھے اندر سے توڑ رہا ہے۔''

32 سالہ یونس ابوعودہ کی فریاد اور بھی دل دہلا دینے والی ہے: ''مجھے یوں لگتا ہے جیسے ہمیں۔ غزہ کے لوگوں کو۔ مرغی خانے میں ڈال کر بھوکا رکھا جا رہا ہے۔ ہم نسل کشی، قحط اور نفسیاتی جنگ سے گزر رہے ہیں، یہ بے دخلی کی جنگ ہے، خیموں کی جنگ ہے، دھوپ اور گرمی کی جنگ ہے۔ ہم پر بمباری کے ساتھ ساتھ بھوک اور پیاس کا عذاب مسلط کر دیا گیا ہے۔''

یہ بیانات صرف چند آوازیں ہیں، مگر ان کے پیچھے لاکھوں دلوں کی چیخیں اور کروڑوں آنکھوں کے آنسو چھپے ہوئے ہیں۔ غزہ کے عوام کی یہ زندگی بتا رہی ہے کہ اسرائیل نے بھوک کو ایک منظم ہتھیار میں بدل دیا ہے، ایک ایسا ہتھیار جو جسم کو نہیں بلکہ روح کو گھائل کرتا ہے۔

لیکن اس سے زیادہ الم ناک اور کربناک حقیقت یہ ہے کہ مسلم ممالک خصوصاً غزہ کے آس پاس کے طاقتور اور مال و دولت میں ڈوبے عرب ممالک بھی اس قیامت خیز مظالم کے سامنے مسلسل خاموش ہیں۔ یہ خاموشی محض لاپرواہی نہیں بلکہ ایک مجرمانہ بے حسی ہے، جو عملی شراکت کے مترادف بنتی جا رہی ہے۔ اربوں ڈالر کے اسلحے کے ذخائر رکھنے والے یہ ممالک اپنی ہی سرزمین سے چند کلو آٹا، چند بوری چاول اور دوا کی معمولی مقدار بھی غزہ کے مظلوم بچوں تک پہنچانے میں ناکام ہیں، تیل کی دولت پر ناز کرنے والی یہ حکومتیں اپنے ہی بھائیوں کے خون اور آنسوؤں پر آنکھیں بند کیے بیٹھی ہیں۔ جب غزہ کے بچے بھوک اور پیاس سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دے رہے ہوں، جب عورتیں ملبوں تلے کراہ رہی ہوں، جب بزرگ قطاروں میں دم توڑ رہے ہوں تب یہ خاموشی تلوار سے زیادہ کاری اور بارود سے زیادہ تباہ کن ہے۔

مسلم ممالک کا رویہ اسلامی تاریخ کا وہ سیاہ باب ہے جسے آنے والی نسلیں شرم کے ساتھ پڑھیں گی اور سوال کریں گی کہ تیل کے سمندر میں ڈوبی ہوئی یہ امت اپنے ہی بھائیوں کے لہو کے سمندر کو کیوں نہ دیکھ سکی؟!

طلباء کا صفحہ

کامیاب زندگی میں وحی الٰہی کی ضرورت

سعید الرحمٰن اسامہ (متعلم شعبۂ اختصاص-علوم القرآن)

انسان کے پاس حصول کے معروف ذرائع حواس خمسہ اور عقل ہیں، ان دو عظیم نعمتوں کے ذریعے انسان دنیاوی زندگی کے بہت سارے معاملات کو سمجھنے کی بھرپور کوشش کرتا ہے، زندگی کے زیادہ تر معاملات اور مشکلات کو حل کرنے میں انسان انہی دو فطری صلاحیتوں کا محتاج رہتا ہے، جس طرح انسان علم و شعور کے لحاظ سے ترقی کرتا جاتا ہے اسی طرح اس کی سوچ اور فکر کا دائرہ بھی وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جاتا ہے، انسان اپنی سوچ اور علم و شعور کی بنیاد پر بہت سارے مشکلات کا حل اور ہزاروں مسائل کے جوابات تلاش کر لیتا ہے اور اپنے آپ کو بذات خود مطمئن کر لیتا ہے لیکن ایک وقت وہ آتا ہے۔

جب انسان محسوس کرتا ہے کی حواس خمسہ اور انسانی عقل اپنے محدودیت کی وجہ سے اس کی زندگی کے بعض اہم سوالات کے جوابات اور زندگی کے اہم مسائل کا حل فراہم کرنے سے قاصر ہو گئی ہے:

۱- مثلاً اس کو کس نے پیدا کیا اور کیوں پیدا کیا؟

۲- اس کی تخلیق اور زندگی کا مقصد کیا ہے؟

۳- کائنات کی تخلیق کا مقصد کیا ہے؟

۴- انسان کی موت کب واقع ہوگی اور موت ہر ایک کو کیوں آتی ہے۔

۵- انسان کی موت کے بعد کیا معاملہ ہوگا؟

۶- دنیا میں رزق کتنا ملے گا اور اس کا حقیقی ذریعہ اور سورس کیا ہے۔

ان اہم سوالات کے جوابات کو جاننے کے لیے موجودہ دور میں انسان سائنس کی طرف رجوع کرتا ہے کیونکہ سائنس ہی وہ معروف ذریعہ ہے جو عام طور پر نفس انسانی اور کائنات کے عمومی سربستہ رازوں کو پردہ خفاء سے منصۂ شہود پر لاتا ہے۔

بے شک سائنس انسان اور کائنات کے کئی اہم سوالات کے جواب دینے کی کوشش کرتی ہے لیکن سائنس کے سارے کے سارے جوابات انسانی ظن و تخمین پر مشتمل ہوتے ہیں۔ یعنی ان کی بنیاد یقین پر نہیں ہوتی، اس کے جوابات مادی اور محسوس اشیاء کے دائرے سے باہر نہیں جاتے نیز پوری دنیا کی سائنس کے پاس مذکورہ بالا سوالات کا صحیح جواب نہیں ہے۔

کائنات کا مقصد تخلیق سمیت سینکڑوں اہم موضوعات ہیں جن کے بارے میں جدید و قدیم انسانی علوم یہاں تک کی سائنس مہر بلب ہے، اس کے بعد اب کون سا ذریعہ اور سورس ہے کہ اس کے ذریعے انسان ان مسائل کے حل کو تلاش کر سکے؟

وحی الٰہی وہ واحد ذریعہ ہے جس کے ذریعے انسان مسائل کو حل کر سکتا ہے اور ان مشکل سوالات کے جوابات آسانی سے پا سکتا ہے۔

کیا انسان واقعی وحی الٰہی کا محتاج ہے؟ کیا اس کے بغیر زندگی بسر کرنا ممکن ہی نہیں؟ منکرین خدا کا خیال ہے کہ جو بھی چیز ہے اس سے فائدہ اٹھایا جائے گا، باقی قرآن و سنت اور وحی الٰہی کی قطعا ضرورت نہیں۔

ان منکرین خدا کے مقابلے میں وہ لوگ ہیں جو آسمانی کتابوں پر اعتقاد رکھتے ہیں، ان میں سر فہرست مسلمان ہیں۔

بعض آسمانی مذاہب پر اعتقاد رکھنے والوں کا خیال ہے مذہب ایک پرائیویٹ معاملہ ہے جس سے انفرادی زندگی میں تو فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے لیکن پوری اجتماعی زندگی بسر کرنے کے لیے اس کی ضرورت نہیں۔ اگر غور کیا جائے تو یہ بھی خالص مادہ پرستی کا مجموعہ ہے۔

جہاں تک اہل اسلام کا تعلق ہے تمام کے تمام وحی الٰہی کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ انہیں میں سے ایک چھوٹا سا طبقہ یہ کہتا ہے کہ وحی الٰہی کا تعلق عاقبت کو سنوارنے کے لیے ہے۔ اللہ کا حکم ہے اس لیے ہم مانتے ہیں اور نظام زندگی کے طور پر کسی بھی نظام کو اپنایا جا سکتا ہے۔ ظاہر بات ہے یہ تصور سراسر غلط ہے۔

ایک دوسرے طبقہ کا خیال یہ ہے بلکہ اعتقاد ہے کہ انسان کو دنیا اور آخرت سوارنے کے لیے وحی الٰہی کی ضرورت انفرادی اجتماعی اور بین الاقوامی ہر لحاظ سے ہے۔ اس طبقے کا ماننا یہ ہے کہ انسان وحی الٰہی کے بغیر ایک صاف ستھری زندگی بسر ہی نہیں کر سکتا، اس سے ہٹنے پر خلاف فطرت زندگی وجود میں آئے گی جو مصنوعی ہوگی۔

وحی الٰہی کی عالمی ضرورت کو خود باری تعالی نے قرآن پاک میں بیان فرمایا ہے: يَا أَيُّهَا النَّاسُ أَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ إِلَى اللهِ وَاللهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ۔ تم ہر کیفیت میں اللہ کے محتاج ہو اس کی قدرت اور اس کی رحمت کے بغیر انسان رہ ہی نہیں سکتا بلکہ اس کا وجود ہی کائنات میں فساد کا موجب بنے گا۔

اس وجہ سے قرآن کریم کا دعوی ہے کہ مکمل سپردگی اور حوالگی کے بغیر انسان ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھ سکتا بلکہ وہ کائنات کا بدترین انسان

ہے، إن الدين عند الله الإسلام ،اسلام کا یہ کہنا ہے کہ اسلام کو چھوڑ کر جو بھی طریقہ اختیار کیا جائے گا وہ دنیا آخرت میں برباد ہوگا اور آخرت کو سنوارنے کے لیے اسلام کی ہر وقت ضرورت ہے،انسان ہر معاملے میں وحی الٰہی کا محتاج ہے۔

قرآن کہتا ہے دل کو خوش کرنے والی پاکیزہ زندگی بغیر اسلام کے ممکن ہی نہیں ،(من عمل صالحاًمن ذكر أو أنثى فلنحيينه حياة طيبة) اگر عمل صالح کے بغیر زندگی گزاری جائے گی تو زندگی اجیرن اور اس کی خوشیاں مصنوئی ہوں گی، خوشی کی تلاش میں انسان مارا مارا پھرے گا، (ولولا فضل الله عليكم ورحمته ما زكي منكم أحدا) صرف کھانے پینے کو زندگی کی حقیقی مسرت سمجھنا قرآن کے نزدیک حیوانی کام ہے، والذين كفروا يأكلون ويتمتعون ،خواہشات پر چلنے والے جانوروں سے بدتر ہیں (افرايت من أتخذ إلهه هواه)

حقیقی بات یہ ہے کہ خدا پرستی سے ہٹ کر اصلاح کے لیے کچھ بھی نہیں،اصلاح کی بنیاد تعلق مع اللہ کے ساتھ ہے، ولا تفسدوا في الارض بعد اصلاحها ،خدا کے باغی بدترین خلائق ہیں، ایک شرک پورے نظام عالم کو تباہ اور تہ بالا کرنے کے لیے کافی ہے (تكاد السماوات يتفطرن منه وتنشق الارض وتخر الجبال هدا، أن دعوا للرحمن ولداً) اس کا اعلان یہ بھی ہے اللہ کو مانے بغیر پاکیزگی کا کوئی تصور نہیں (إنما المشركون نجس) جب پاکیزگی کی بنیادی نہیں تو کون سی پاکیزگی اس کے پاس آسکتی ہے دنیا میں جو بھی ہے عبادت کی بنیاد پر ہے (قل ما يعبا بكم ربي لولا دعائكم) (الدنيا ملعونه إلا ذكر الله ومن والاه أو عالم أو متعلم) ہر جہنمی کفر کرنے والا سب سے بڑا پاگل اور بے وقوف ہے وقالوا لو كنا نسمع نعقل ما كنا في أصحاب السعير ، یہ تمام اعلانات اور دلائل قرآن کو ماننے والوں کے لیے ہیں۔

قرآن کا دعوی یہ ہے کہ انسان وحی الٰہی اور الٰہی ہدایت کے بغیر ذرہ بے مقدار سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں،وہ جو کچھ بھی ہے خدا کی وابستگی کی بنیاد پر ہے، *والذين نسوا الله فانساهم أنفسهم قل إن الهدى هدى الله* غور کیا جائے تو قرآن کی بات ہزار فیصد درست ہے،انسان اپنی ذات کے لحاظ سے عالمی بن ہی نہیں سکتا کہیں نہ کہیں ٹھوکر کھائے گا،انسان اپنی اصل کے لحاظ سے مفادات اور اغراض سے بالاتر نہیں رہ سکتا اگر وحی الٰہی نہ ہو،اس کے کہ ہر انسان افکار و خیالات اور نسل و رنگ علاقائیت زمانے کا قیدی ہوتا ہے، لاکھ وہ باور کرائے کی وہ ان سب سے آزاد ہے، انسان ان بیڑیوں کو توڑ نہیں سکتا لہٰذا وہ تمام انسانیت کے لیے مفید نہیں ہوسکتا۔

کوئی بھی شخص یہ دعوی نہیں کرسکتا کہ ہم سب کے لیے یکساں مفید ہیں، کوئی بھی ظروف اور ملابسات سے بالاتر نہیں ہوسکتا لہٰذا نہ وہ نظام عالم وضع کرسکتا ہے نہ نظام اخلاق۔

جب یہ طے ہوگیا کہ انسان نظام عالم اور نظام اخلاق پیش نہیں کرسکتا تو اس کی بنیاد پر بہت سارے اختلافات جنم لیں گے اور یہ اختلافات آپس میں زہر گھولیں گے، ہر انسان کو اس بات پر اصرار رہے گا کہ دوسرا انسان اس کے نظام کو تسلیم کرلے،انسان نظام اخلاق اگر وضع بھی کردے تو مسلسل خانہ جنگی کا سلسلہ جاری رہے گا۔

یہ بات بھی یقینی ہے کہ انسانی نظام مخلوق پر چل کر کل انسانیت کے لیے رحمت نہیں بن سکتا، انسان کے لیے ضروری ہے کہ کسی ایسی ہستی کی پیروی کرے جس نے تمام کا یکساں خیال رکھا ہے، ملحد سے ملحد انسان یہ بات ماننے پر مجبور ہے کہ نظام اسے وضع کرنا چاہیے جو تمام مخلوقات سے ہر لحاظ سے بالاتر ہو اور وہ ذات صرف اللہ رب العزت کی ہے (قل هو الله أحد الله الصمد لم يلد ولم يولد ولم يكن له كفوا أحد)۔

انسان کے عالمی بننے کے لیے لازم ہے کہ وہ کسی ایسی ہستی کا تابع بن جائے جس کے لیے تمام انسان یکساں ہوں، اگر کسی کے دعوے کو سچا مان بھی لیا جائے تو اسی طرح کے تمام انسانوں کو وضع کرنے کا حق کیوں نہ ہو حالانکہ اس کا انکار وہ خود کرے گا،اسی طرح اس ہستی کی لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ہر چیز پر غالب اور ہر چیز سے باخبر ہو اور وہ خدا کی ذات ہے وهو القاهر فوق عباده وهو الحكيم الخبير ،اس ہستی کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ہر ایک کے مفاد کا یکساں خیال رکھے،کسی کا اس پر بس نہ چلے،کسی سے رشتہ داری نہ ہو ان تمام صفات کی حامل صرف خدا کی ذات ہے (وهو القاهر فوق عباده، وهو الحكيم الخبير، يفعل ما يشاء ويحكم ما يريد وربك يخلق ما يشاء ويختار ما كان لهم الخيرة)

ان تمام عقلی اور نقلی دلائل سے یہ بات یقینی ہو جاتی ہے کہ وحی الٰہی پر مبنی اللہ تعالی کا یہ آخری کلام انسانی ذہن میں پیدا ہونے والے تمام اہم ترین شخصی، نفسیاتی، الٰہیاتی، علمیاتی ،کونیاتی سوالات کا کافی وشافی جواب آج بھی اسی طرح فراہم کرتا ہے جس طرح آج سے ساڑھے چودہ سو برس قبل اس کلام الٰہی نے اپنے نزول کے وقت انسانوں کی انفرادی، اجتماعی، معاشرتی سیاسی، اقتصادی، قانونی، تہذیبی، ثقافتی، تاریخی، علمی، فکری ،نظریاتی اور اعتقادی مسائل کو حل کیا تھا۔

❁❁❁

ندوۃ العلماء منزل بہ منزل

مذاکرۂ علمی کا انعقاد

زیر اہتمام: مجلس تحقیقات شرعیہ

(جولائی) ''خلع کی شرعی و قانونی حیثیت اور عدالتی فیصلوں کا جائزہ'' کے عنوان سے مجلس تحقیقات شرعیہ کی ماہانہ مذاکراتی نشست منعقد ہوئی جس میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے ڈاکٹر نظام الدین (سابق اسسٹنٹ پروفیسر جندل لاء اسکول) و دیگر وکلاء نے شرکت کی۔

ڈاکٹر نظام الدین اپنے کلیدی خطاب میں نے خلع کی قانونی حیثیت پر روشنی ڈالتے ہوئے عدالتی فیصلوں کا تفصیلی جائزہ پیش کیا، اور کہا کہ خلع کے سلسلہ میں ۱۹۳۷ء کا شریعہ اپلیکیشن ایکٹ سب سے اہم اور بنیادی حیثیت رکھتا ہے، اس ایکٹ میں طلاق اور خلع کا بھی ذکر ہے، اس ایکٹ کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کے عائلی قوانین شریعت کے تحت حل کیے جائیں، لیکن اس قانون میں چند پیچیدگیاں تھیں، جن کے حل کے لئے ۱۹۳۹ء اقانون لایا گیا۔

صدر مجلس مولانا عتیق احمد بستوی نے کہا کہ ہمیں مایوس ہونے کی نہیں بلکہ مسائل کا حل نکالنے کی ضرورت ہے، مسلمانوں کو چاہیے کہ اپنے معاملات دار القضاء کے ذریعہ حل کرائیں، عدالت' فیصلہ اس وقت کرتی ہے جب ہم اپنے مسائل وہاں لے کر جاتے ہیں، دار القضاء میں سکون کے ساتھ مسائل حل ہو جاتے ہیں جبکہ عدالت جانے کے بعد مسائل مزید الجھ جاتے ہیں۔

اس پروگرام میں ماہرین قانون، وکلاء اور دار العلوم کے اساتذہ و اختصاص کے طلباء شریک ہوئے۔ اخیر میں سوالات و جوابات کی نشست بھی ہوئی۔

آغاز محمد ظہیر کی تلاوت قرآن سے ہوا اور مفتی محمد نصر اللہ ندوی نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔

'فرسان العلم والأدب' کا اجرا

(مرتبہ: ڈاکٹر محمد وثیق ندوی)

(جولائی) ناظم ندوۃ العلماء حضرت مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی مدظلہ نے ''فرسان العلم و الأدب'' کا اجرا کرتے ہوئے فرمایا: ''طلباء کو ایسی کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہیے جن سے زبان و بیان بھی درست ہو اور مفید معلومات بھی حاصل ہوں''۔

مولانا نے مزید فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ نے مولانا وثیق صاحب کو لکھنے کا اچھا سلیقہ دیا ہے، یہ کتاب ان کے مختلف مضامین کا مجموعہ ہے جس میں حضرت سید احمد شہیدؒ سے لے کر اب تک کی اہم شخصیات کا تذکرہ ہے، زیادہ تر شخصیات وہ ہیں جن کا ندوۃ العلماء سے تعلق رہا ہے، طلباء کو اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیے کہ اس سے دو فائدے حاصل ہوں گے، ایک تو زبان درست ہوگی اور لکھنے کا سلیقہ آئے گا، اور دوسرے اہم شخصیات سے متعلق معلومات حاصل ہوں گی۔''

مولانا ڈاکٹر محمد وثیق ندوی کی یہ کتاب ان کے مختلف مضامین و مقالات کا مجموعہ ہے جو انھوں نے مختلف موقعوں پر اور خاص کر پندرہ روزہ الرائد کے لیے لکھے ہیں، ان مضامین میں زیادہ تر انہیں شخصیات کا تذکرہ شامل ہے جو میدان علم و ادب کی شہسوار رہی ہیں، اور جن کی علمی و فکری خدمات سے استفادہ کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ زبان و بیان کی عمدگی و پختگی کی وجہ سے یہ کتاب طلباء و اساتذہ دونوں کے لیے یکساں مفید ہے۔

ناظم ندوۃ العلماء کی عشاء بعد کی مجلس میں اس کتاب کا اجرا ہوا، اس موقع پر بڑی تعداد میں طلباء و اساتذہ موجود تھے۔

'خطباتِ محمود' کا اجرا

(مرتبہ: مولانا سلمان بجنوری ندوی)

(اگست) ''مولانا محمود حسنی ندویؒ ایک اچھے مصنف، کامیاب مصنف گر اور اچھے مقرر تھے، خدا تعالیٰ نے ان کو لکھنے کا اچھا ذوق عطا کیا تھا، ان کا قلم بہت سیال تھا، سو سو صفحے کی کتابیں چند ہی دنوں میں لکھ لیا کرتے تھے، لگتا تھا کہ مراجع کی ساری کتابیں ان کی نگاہوں کے سامنے ہیں، ان کا حافظہ بہت اچھا تھا، اسی لیے ان کو بار بار کتابوں سے مراجعت کی ضرورت بھی نہیں ہوتی تھی، وہ کہیں بھی بیٹھ کر اپنے لکھنے کا کام کر لیا کرتے تھے، ان کا تاریخی اور علمی ذوق بلند تھا، سب جانتے ہیں کہ وہ ایک اچھے مصنف تھے لیکن یہ بہت کم لوگ جانتے ہوں گے کہ وہ ایک اچھے مقرر بھی تھے، وہ جن باتوں کو ضروری سمجھتے تھے ان کو بیان کرتے تھے، اپنی عمر کے آخری دنوں میں تقریر کے چھوٹے چھوٹے ویڈیو بنواتے تھے جن سے لوگوں کو فائدہ ہوتا تھا۔ ان خیالات کا اظہار ناظم ندوۃ حضرت مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی نے کتب خانہ علامہ شبلی نعمانی میں ''خطبات محمود'' کے اجرا کے موقع پر کیا۔

حضرت مولانا اپنی تقریر میں مزید کہا کہ مولانا محمود حسنی کے تمام خطبات تو محفوظ نہیں رہ سکے کہ ان کا پہلے کوئی اہتمام بھی نہیں کیا گیا لیکن ان کی جو تقریریں موبائل اور سوشل میڈیا کے ذریعہ عام ہوئیں اور وہ محفوظ ہوئیں ان کو ہمارے عزیز مولانا سلمان بجنوری ندوی نے جمع کر کے ایک پوری کتاب مرتب کر دی۔ یہ بڑی خوشی اور کام کی بات ہے، یقیناً یہ ان کے لیے صدقہ جاریہ ہے۔

اس موقع پر مولانا محمد عمار حسنی ندوی، مولانا کمال اختر ندوی، مولانا عبدالعزیز بھٹکلی ندوی، مولانا محمد علاء الدین ندوی، مولانا خالد غازی پوری ندوی، مولانا عتیق احمد بستوی، مولانا نیاز احمد ندوی، مولانا ابو سحبان روح القدس ندوی و دیگر اساتذۂ کرام اور مہمانانِ شہر موجود تھے۔

(محمد نفیس خان ندوی)

NADWATUL-ULAMA
PO. BOX 93, TAGORE MARG, LUCKNOW
226007 U. P. (INDIA)

ندوۃ العلماء
پوسٹ باکس ۹۳، ٹیگور مارگ، لکھنؤ
۲۲۶۰۰۷ یوپی (ہند)

باسمہٖ تعالیٰ

Date 10,25 September 2025

تاریخ ۱۰-۲۵/ ستمبر ۲۰۲۵ء

اہلِ خیر حضرات سے

اللہ تعالیٰ کا شکر واحسان ہے کہ حضرت ناظم صاحب ندوۃ العلماء مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی دامت برکاتہم کی سرپرستی میں ندوۃ العلماء اپنی علمی، دینی، تعلیمی وتربیتی خدمات انجام دے رہا ہے، اور ان بیش قیمت اصولوں کو سینے سے لگائے ہوئے ہے جن کے لیے ندوۃ العلماء کو قائم کیا گیا تھا، یعنی جدید زمانہ میں اسلام کی مؤثر اور صحیح ترجمانی، دین ودنیا کی جامعیت اور علم وروحانیت کے اجتماع کی کوشش، فتنۂ لادینیت اور ذہنی ارتداد کا مقابلہ، اسلام پر اعتماد اور اسلامی علوم کی برتری وامتیاز کا اعلان واظہار، دینِ حق سے وفاداری اور شریعت پر استقامت۔

آپ سے ہماری درخواست ہے کہ وقت کی اس ضرورت اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کی افادیت کو سمجھتے ہوئے پوری فراخدلی، فیاضی اور ہمت سے کام لے کر ان تمام کاموں میں بھرپور تعاون واعانت فرمائیں کہ ہندوستان میں دین کے قلعوں کی حفاظت کی اس سے بہتر کوئی سبیل اور اس سے زیادہ پائدار کوئی صدقہ جاریہ نہیں۔

لہٰذا آپ حضرات سے گزارش ہے کہ اپنے صدقات وعطیات چیک یا ڈرافٹ کے ذریعہ اور آن لائن ندوۃ العلماء کے مندرجہ ذیل اکاؤنٹ میں منتقل فرمائیں، ایسے نازک اور مشکل حالات میں ندوۃ العلماء کے ساتھ آپ کا تعاون نہایت اہمیت رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کی کاوشوں کو قبول فرمائے اور ان کو ہمارے لیے ذخیرۂ آخرت بنائے، آمین۔

(مولانا ڈاکٹر) تقی الدین ندوی	(ڈاکٹر) محمد اسلم صدیقی	(مولانا ڈاکٹر) سعید الرحمٰن اعظمی ندوی	(مولانا) محمد عمار حسنی ندوی
معتمد تعلیم ندوۃ العلماء	معتمد مال ندوۃ العلماء	مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء	ناظر عام ندوۃ العلماء

NADWATUL ULAMA

عطیات A/c No. 1086 3759 711

تعمیرات A/c No. 1086 3759 733

زکوٰۃ A/c No. 1086 3759 766

IFSC CODE : SBIN0000125 - STATE BANK OF INDIA, MAIN BRANCH, LUCKNOW

ONLINE DONATION LINK

https://www.nadwa.in/donation/

نوٹ: چیک/ڈرافٹ پر صرف یہ لکھیں:

NADWATUL ULAMA

اور اس پتہ پر ارسال کریں:

Nizamat office, Nadwatul Ulama,
Tagore Marge, Lucknow - 226007 (U.P.)

معطیان کرام! براہ کرم اپنے عطیات ارسال کرنے کے بعد مندرجہ ذیل نمبر

+91-8736833376

پر مطلع فرمانے کی زحمت کریں، اس سے دفتری کارروائی میں سہولت ہوگی۔

فجزاکم اللہ خیر الجزاء

website : www.nadwa.in
Email : nizamat@nadwa.in

نوٹ: ندوۃ العلماء لکھنؤ کو دیا گیا تعاون سیکشن 80G انکم ٹیکس ایکٹ ۱۹۶۱ء کے تحت انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہوگا